گرداب کی شناوری (حصۂ دوم)

منزل گریزاں

گرداب کی شناوری حصہ دوئم

زہرا داؤدی

کتاب .... منزل گریزاں

گرداب کی شناوری (حصہ دوئم)

مصنفہ .... زہرا داؤدی

قیمت .... -/100 روپے صرف

اشاعت .... بار اوّل

اگست ۲۰۰۱ء

تعداد .... پانچ سو

طابع .... البعوریہ پریس A-20 سائرہ مینشن

ایم اے جناح روڈ کراچی

فون : 7729249

پتہ :

Plot No. 25-C, Shop No.2, Badar Commercial
Area, ST. No. 10, Phase V Ext. D.H.A.,
Next to Hanif Rajput Office
Website: www.buysell.com.pk/booksunlimited

انتساب

''انسان''

کے نام

پیش لفظ

جب ہم نے اپنی آپ بیتی لکھنی شروع کی تھی اور وہ بھی پبلک یعنی دوستوں کے بے حد اصرار پر تو میری اپنی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ بھلا میری آپ بیتی میں کیا اہم بات ہو سکتی ہے جو کوئی اسے پڑھنے کی زحمت گوارہ کرے گا۔ خیر خدا خدا کر کے "گرداب کی شناوری" مکمل ہو کر منظر عام پر آئی۔ خاصی یعنی امید سے کہیں زیادہ اس کی پذیرائی بھی ہوئی اور تب مجھ پر گویا انکشاف ہوا کہ آپ بیتی تو اصل میں جگ بیتی ہوتی ہے اور یہ اس وقت تک جاری رہتی ہے جب تک کہ قلم کار کا کردار منزل حیات طے گزر رہا ہوتا ہے چنانچہ اس انکشاف کے بعد پھر سے زیست اور ذاتی ڈائری دونوں ہی کے اوراق پر نشان کا جائزہ لینے پر پتہ چلا کہ زندگی کے اس دوراہے پر براہ راست خود سے منسلک واقعات وحادثات سے تو کم لیکن ایسے تجربات وتاثرات ڈھیروں ہیں جو بظاہر میری اپنی ذات پر اثرانداز ہوتے نظر نہیں آتے یا میں جن کا ایک معمولی کردار بھی نہیں ہوں مگر جیسا کہ میں نے اشارہ کیا' ہر فرد میں اس کی ذاتی زندگی کے چھوٹے موٹے واقعات سے لے کر بڑے بڑے عالمی مسائل اور اتھل پتھل تک سبھی ذاتی زندگی اور اجتماعی زندگی دونوں ہی کا رنگ روپ بنانے یا بگاڑنے میں برابر سے حصہ دار ہوتے ہیں۔

سو یوں ہے کہ "گرداب کی شناوری" کا دوسرا حصہ "منزل گریزاں" کو وجود میں آنے کا بہانہ مل گیا۔ اب دیکھیں اسے کیا پذیرائی ملتی ہے۔

زہرا داؤدی

زندگی کی پہلی منزل

"اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے"

جیون یاترا کا قصہ سنانے تو بیٹھی ہوں پر سمجھ میں نہیں آتا کہ ڈور کہاں سے پکڑی جائے۔ اتنی متضاد راہوں سے واسطہ پڑا کہ اگلی منزل کا رخ کس سمت ہوگا یا ڈور ہاتھ چھڑا کر کہاں بھاگ جائے گی اندازہ ہی نہیں ہو پاتا اور یہ تو کوئی کہانی نہ ہوگی' نہ انوکھی آپ بیتی' نہ سننے سنانے والی۔ سرگذشت حیات کہ میں فلاں سن فلاں تاریخ کو فلاں جگہ پیدا ہوئی عمر کے ابتدائی چند سال..... لیکن مجھے کہانی کہاں لکھنا ہے میں تو بس اپنی زندگی کے ہمہ وقت دھماکہ خیز لمحات' روز وشب کو یادداشت کی اسیری سے نکال کر لفظوں کی آواز دینا چاہتی ہوں۔ ان اتھل پتھل جذبات و حرکات کو قلم کی آواز کے سپرد کر کے دوام بخشنا چاہتی ہوں جنہوں نے کبھی میرے پیروں تلے سے زمین سرکائی اور کبھی سماج کی فرسودہ روایتوں اور رسوم کو ڈانواڈول کر دیا تو کبھی سائنٹفک اور عقلی اجتہاد سے خائف ملا کی فتویٰ سازی کے خلاف علم اٹھایا۔ بہرحال اب جب کہ ماضی کے دشت خار یا گلزار میں قدم رکھ ہی دیا ہے تو ایک حد تک خود نوشت کے مطالبات کا احترام کرنا ہی پڑے گا۔ سوبھار کا چھپرہ ضلع (یا شہر) میری جائے پیدائش ہے۔

وہ مکان جہاں ہم نے جنم لیا بنگلہ کہلاتا تھا۔ شاید انگریزوں کے دور حکومت میں اسی طرز کے مکانات شہر کے امیروں' رئیسوں کے شایان شان ہوتے اور بنگلہ کہلاتے ہوں گے۔ وسیع و عریض عمارت۔ اس دور کی ساری سجاوٹوں سے مرصع۔ اماں بیاہ کر

اسی بنگلہ میں آئی تھیں۔ شاید یہ پرانی وضع داری اور بہار کے شرفاء کے کلچر کا مطالبہ تھا کہ ابا کو ان کے خاندان والوں نے مقدمہ بازی میں ایسا پھنسایا کہ بنگلہ جائیدادیں، زمین اور ملیں وغیرہ سب نیلام ہو گئیں۔ ابا دل برداشتہ ہوئے اور چھپرہ چھوڑ حیدر آباد دکن جا بسے کہ جہاں وہ رئیس اور مل مالک رہے وہاں تنکا تنکا بٹور کر پھر سے آشیانہ بنانا ان کے لئے ممکن نہ تھا۔ کریم چک چھپرہ کا بنگلہ ابا نے اماں کو مہر میں لکھ دیا تھا۔ وہ بھی مار آستین عزیزوں کی ریشہ دوانیوں، فرضی کاغذات اور اماں کی ناتجربہ کاری کے طفیل (بظاہر) بہی خواہوں اور عزیزوں کے ہاتھ لگ گیا۔ چنانچہ ابا کے حیدر آباد جانے کے چند ہی مہینوں کے اندر اندر اماں کو دو بچوں یعنی اشرف بھیا اور مجھے لے کر اپنی اماں کے گھر مصلح پور جانا پڑا۔ امجد پٹنہ پہنچنے کے دو ماہ بعد پیدا ہوئے۔

نانی اماں کے گھر میں ہم لوگ تقریباً تین سال رہے۔ اس لئے اس گھر کا چپہ چپہ مجھے یاد ہے۔ ویسے اس مکان سے بچپن کی حسین یادوں کے بجائے محرومی اور بے بسی کا ہی جذبہ وابستہ ملتا ہے کہ اماں اپنا گھر چھوڑ کر میکے میں خوش نہ تھیں اور ہم اپنے کو باپ کے تحفظ اور شفقت سے محروم محسوس کرتے تھے۔ ویسے ایک بار مصلح پور سے آجانے کے بعد پھر دوبارہ اس مکان میں جانے کی نوبت نہ آئی کہ ہم لوگ اپنے ابا کے پاس حیدر آباد چلے گئے اور نانی اماں اپنے میکہ کے آبائی گھر نگرنہسہ میں۔ مزے کی بات تو یہ ہے کہ میں نے اپنا آبائی گھر موسوم بہ بنگلہ جو دو برس کی عمر میں چھوڑا تو پھر شادی کے بعد حبیب کے ساتھ انہیں کے ایک عزیز سے ملنے چھپرہ گئی اور محض مہمیز تجسس کے تازیانہ کے طفیل ایک گھنٹہ کے لئے اس بنگلہ پر بھی گئی جو اس وقت تک قانوناً" اماں کی ملکیت تھا لیکن قبضہ میں دوسرے بھائی بندوں کے تھا۔

لوگ اپنی خاندانی کوٹھی، حویلی، بنگلہ یا عام سا مکان ہی کیوں نہ ہو اسے بہت یاد کرتے ہیں جہاں ان کی پیدائش ہوئی ہو یا جہاں بچپن گزرا ہو۔ اس کے چپے چپے پر کونے کونے پر اپنے وجود کا نقش پاتے ہیں۔ مجھے گھر کے ساتھ کسی ایسے جذبے سے کبھی کوئی واسطہ نہ پڑا۔ ہمیشہ ہی کرایہ کے گھر میں بسر ہوئی۔ سو نہ کبھی کسی مکان سے

وابستگی ہوئی اور نہ اس کی یاد اسے چھوڑ دینے کے بعد آئی۔ نہ اس کے کمروں، اس کے جھروکوں اس کے در و دیوار نے کسی گھر سے محرومی یا اس سے چھننے کی کوئی کسک دل میں پیدا ہوئی تھی۔ ہاں کسک جو ہے اور لا دوا اولادرمان ہے وہ اس مٹی کی خوشبو کی ہے جو میری تھی اور رہے گی۔ ان فضاؤں کی ہے ان صبح و شام کی ہے جو ہو سکتا ہے کہ آج سہانے کے بجائے میرے لئے تمازت سے بھرپور ہوں لیکن جس ماحول نے میری سرشت کو بنایا سنوارا تھا۔ مجھے انسانیت کی جلا بخشی تھی کہ باد سموم کا کوئی جھونکا، کوئی آندھی بھی مجھے انسان سے بدظن نہ کرسکی۔ آخر میں آکر ذاتی مکان کراچی میں ایک چھوڑ کئی بنائے لیکن تب اتنی ذہنی پختگی آچکی تھی کہ اپنا گھر ہر جگہ کی مٹی سے تعمیر نہیں ہوتا کہ گھر گھروندہ نہیں ہوتا کہ جہاں بیٹھے بنالیا....... چلئے میں بھی کہاں سے کہاں بھٹک گئی۔

چنانچہ میں چھپرہ میں پیدا ہوئی۔ ابا کی شاید بارہویں یا تیرھویں اولاد تھی۔ ٹھیک سے پتہ نہیں۔ اماں کی تیسری تھی مجھ سے پہلے دو بھائی علی اشرف اور علی انور پیدا ہوئے۔ انور کا انتقال دوران شیرخواری ہی ہوگیا تھا۔ علی اشرف بھیا علی گڑھ میں سکونت پذیر ہیں۔ مجھ سے چھوٹے علی امجد کراچی میں وکالت کررہے ہیں۔ امجد سے چھوٹی ایک بہن تھی جس کا انتقال ڈھائی سال کی عمر میں حیدر آباد میں ۱۹۳۳ء میں ہوا۔ ابا نے تین شادیاں کیے بعد دیگرے کی تھیں ویسے کسی بیوی کی حیات میں اس پر سوکن نہیں لائے۔ میری امی سب سے آخری تھیں جن کا انتقال ۱۹۶۶ء میں دسمبر میں کراچی میں ابا کے انتقال کے تقریباً دس سال بعد ہوا۔ میری پہلی دو اماؤں سے چار لڑکے تھے باقیوں کا انتقال اماں کی شادی سے پہلے ہی ہوچکا تھا۔ سب سے بڑے بھائی کا نام علی اسید تھا۔ ہم سب بھائی بہن ان کو بڑکے بھیا کہتے تھے۔ وہ اپنی والدہ کی واحد اولاد تھے۔ دوسری والدہ سے علی اسلم، علی حسن اور علی اطہر تھے۔ ان سبھوں کا انتقال ہوچکا ہے۔

میری اماں بے حد صبر و برداشت، تحمل، روادار اور محبت کرنے والی خاتون

تھیں۔ انہوں نے کبھی اپنے کسی قول و فعل اور انداز سے اپنے اور سوتیلے میں فرق نہ کیا اور نہ کبھی اپنے گھر میں اپنے بچوں سے لفظ سوتیلی سننا گوارہ کیا۔ خاصی عمر ہو جانے تک ہم لوگوں کو پتہ بھی نہ چلا کہ ہم نے مختلف اماؤں کی کوکھ سے جنم لیا ہے اور اس حقیقت کا انکشاف بھی اماں کی زبانی نہیں بلکہ رشتہ داروں کے ذریعے ہوا۔ ناسمجھ بچپن کا ایک واقعہ بھلائے نہیں بھولتا۔ ہم اور امجد سنڈریلا کی کہانی پڑھ رہے تھے امجد نے مجھ سے اسٹپ مدر کا مطلب پوچھا اور میں نے بڑے بزرگانہ اور فہمائشی انداز میں کہا "ارے تمہیں معلوم نہیں اسٹپ مدر سوتیلی ماں کو کہتے ہیں نا! اور "دھپ" اماں کے ہاتھوں کی شاید یہ پہلی دھپ تھی اور یہ میرے شعور اور یادداشت سے چمٹ کر رہ گئی ہے... "یہ کہاں سے سیکھا ہے؟" "بتاؤ تو کون ہوتی ہے سوتیلی ماں...!" دو چار اور دھپ لیکن اتنا ہولے ہولے جیسے پیٹھ پر سرزنش کے سدا بہار اور سدا یاد رہنے والے پھول گر رہے ہوں اور تو کچھ سمجھ میں نہ آیا اور نہ اماں کے تیور دیکھتے ہوئے ان سے کچھ پوچھنے کا حوصلہ ہوا لیکن اتنا ہم دونوں بہن بھائیوں نے ضرور سمجھ لیا کہ شاید سوتیلی ماں گالی ہے تبھی تو اماں اتنی خفا ہو رہی ہیں۔

ہمارے گھر کا ماحول ایک طرف فرسودہ اور دقیانوسی تھا جہاں آٹھ سال کی بچی سے پردہ کرایا جاتا تھا تو دوسری طرف انتہائی غیر متعصب اور مذہبی و روحانی افکار و عمل کے لحاظ سے سیکولر۔ چنانچہ سیاسی لحاظ سے ابا کانگریسی تھے اور ہندو مسلم اتحاد کے زبردست حامی۔ مذہبی بنیادوں پر تقسیم ملک کی تحریک سے دور کا بھی واسطہ نہیں اور سیاست کو مذہب سے علیحدہ رکھنے کے علم بردار۔ بہرحال گھریلو ماحول نہ تو مغربی تھا اور نہ ملحدانہ۔ ابا اماں دونوں روزے نماز کے پابند تھے۔ عام اصطلاح میں میرے ابا وہابی تھے اور اماں کو عقیدتاً" وہی ہونا چاہئے تھا جو ابا تھے۔ ویسے ابا کو وہابی کہے جانے پر اعتراض تھا وہ اپنے کو غیر مقلد کہتے تھے۔ میرے نانا بھی وہابی تھے اور عورتیں چہار دیواری کے اندر رہنے والی پردہ نشین کہ اپنے باپ، بھائی، چچا اور ماموں کے علاوہ ہر مرد غیر محرم گردانا جاتا تھا اور اس سے منہ چھپانے والا پردہ شرعی احکام میں شامل

تھا۔ اماں کو پڑھنے کا بہت شوق تھا سو جانے کیسے قرآن شریف کے علاوہ وہ خاصی استعداد اردو پڑھنے لکھنے کی انتہائی کمسنی میں پیدا کر لی تھی۔ پھر شادی کے پہلے تک حویلی کی چہار دیواری کے اندر شرعی پردہ کرنے، گھرداری سیکھنے اور ساری۔ رائج الوقت مذہبی اور سماجی زیادتیوں کے ساتھ سمجھوتہ کرنے اور اپنے سے تیس سال بڑے شوہر اور تین سال بڑے بیٹے کے ساتھ ہنسی خوشی بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ بغیر قسمت کو الزام دیئے برداشت کرنے کی صلاحیت پیدا کرنے میں مصروف ہو گئیں۔ نانا ابا مہدانواں گاؤں کے سربراوردہ زمینداروں میں تھے اور اس دور کے زمینداروں کے اوصاف سے تو یقیناً متعصف لیکن آج کے سندھ کے وڈیروں سے خاصی حد تک کم بہائیم صفت۔

اماں شادی کر کے چھپرہ آ گئیں۔ ماحول نسبتاً" آزاد خیال ملا لیکن سب سے بڑی گڑبڑ اماں کے لئے یہ ہوئی کہ میرے ابا اپنی ساری قابلیت علم اور اعلیٰ سماجی مرتبہ کے ساتھ ساتھ اماں سے عمر میں تیس سال بڑے بھی تھے۔ اس لئے شاید میاں بیوی میں رفاقت کا جذبہ اور رشتہ کبھی جنم نہ لے سکا اور جب جنم ہی نہیں لیا تو پنپنے کا کیا سوال اور اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ اس دور کی ساری ہی خواتین کے خمیر میں یا صرف اماں ہی میں اس نے کن اجزا کی کمی بیشی کی تھی کہ یہ بے غرض اور خاموش قربانی اور نفس کشی جیسی صفات اور صلاحیتوں میں گوتم بدھ اور بڑے بڑے رشیون مینون کو بھی مات دے بیٹھیں۔

ہمارے اپنے چچا، تایا ماموں کوئی بھی نہ تھے۔ خالہ زاد اور پھوپھی زاد عمر میں خاصے بڑے نتیجہ یہ کہ ہم عمر اور چنچل کزن عنقا...... سو عمر کا نوخیز دور جسے سنہرا ہونا چاہئے تھا۔ چٹیل ریگستانی اور ویران رہا۔ قرۃ العین حیدر کے کزنوں کی شوخ و شنگ داستانیں پڑھ پڑھ کر دل بہت اداس ہوا کرتا تھا اور ایسے پیارے پیارے کزنوں سے محرومی کا احساس ناپختہ عمر تک سانپ کی مانند ڈستا رہا۔ گزرا ہوا وقت یا دور اچھا سہانا گزرا ہو یا برا لمحہ لمحہ قدم قدم تپتے سنگریزوں پر ننگے پیروں چلنا پڑا ہو یا پھولوں کی سیج پر

عمر لزری ہو۔ حال کا مزہ لینے کے لئے اپنے آپ کو صحیح طور پر سمجھنے اور اپنی خودنوشت پڑھنے والوں کے ساتھ ایمانداری اور انصاف کے لئے "گزرے کل" میں واپس جانا ضروری ہے۔ ہجری سنہ کے حساب سے تو یہ پتہ نہیں کہ محرم کا مہینہ تھا یا عید کا، شب برات تھی یا تیرہ و تاریک رات لیکن اتنا ضرور سن رکھا ہے کہ والدین کے لئے خصوصی نوید مسرت لے کر آتی کہ پانچ بیٹوں کی موجودگی میں اماں ابا کو بیٹی کی بڑی ہی تمنا تھی۔ بہرحال مارچ کی ۱۶ تاریخ ۱۹۲۳ء میں ہم عدم سے گردش دوراں کی نیرنگی دیکھنے کو اس عالم رنگ وبو میں وارد ہوئے جیسا کہ میں لکھ چکی ہوں۔

ساری عمر چھ بھائیوں کی اکلوتی بہن رہی۔ سوائے ڈھائی سال کے مختصر وقفے کے سکینہ مجھ سے چھ سال چھوٹی تھی جو ڈھائی سال کی ننھی سی عمر میں اجل سے دوستی کر بیٹھی۔ ان دنوں ہم لوگ حیدرآباد دکن میں تھے۔ وہاں طاعون پھیلا اور میری معصوم بہن گھنٹوں میں چٹ پٹ ہو گئی۔ جب سکینہ ختم ہوئی تو بارش ہو رہی تھی۔ اماں نے آنسوؤں سے جل تھل آنکھوں کے ساتھ اپنی بچی کو نہلا کر کفن میں سنوارا اور باپ بھائیوں کے ساتھ قبرستان روانہ کیا۔ میں نے زندگی میں پہلی اور آخری بار ابا کو آنسو بہاتے دیکھا اور تعجب کیا کہ ابا لوگ اماں کی طرح رو بھی سکتے ہیں۔ مجھے اپنی بہن کی موت کا صدمہ بہت دنوں تک رہا۔ عرصہ تک میں اس کے لال جوتے کو سب کی نظروں سے چھپا کر بکس کی زینت بنائے رہی۔ مجھے یہ امید تھی کہ کسی روز سکینہ جنت سے واپس آکر اپنے ننھے منے پیروں میں اپنے جوتے پہننے کی ضد کرے گی تو.... جب خاصے دنوں تک سکینہ نہ آئی تو اماں نے بڑے جتنوں سے یقین دلا دیا کہ جنت سے واپس اس آب و گل کی دنیا میں کوئی نہیں آتا تو پھر سکینہ سے ملنے کے لئے میں نے خود ہی واصل جنت ہونے کا فیصلہ کر لیا اور وہ بھی دس سال کی عمر ہونے سے پہلے پہلے کہ سن رکھا تھا کہ دس سال کی عمر تک بچہ معصوم رہتا ہے اور مرنے کے بعد سیدھا جنت میں داخلہ ملتا ہے۔ میری معصومیت کی عمر ڈھلتی جا رہی تھی اور ڈر تھا کہ مرنے میں دیر ہو گئی تو نہ سکینہ ملے گی اور نہ جنت۔

گھر میں ایک سنکھیا کے ست کی شیشی رہتی تھی۔ شاید اس کا دو قطرہ پانی میں ملا کرابا استعمال کرتے تھے۔ سنکھیا زہر ہے یہ پتہ تھا۔ ایک روز شیشی میں نے اس نیت سے اٹھا کر چھپالی کہ اسے پی کر مرجاؤں گی۔ اس آرسنک کے ست کا اثر موت کی صورت میں تو خیر کیا ظاہر ہوتا لیکن میرا معصوم سا اکتایا ہوا وجود بہت خوش اور مطمئن تھا کہ اب جنت میں سکینہ کے ساتھ خوب مزہ آئے گا۔ دل ویسے بھی ڈھائی گز کا دوپٹہ اور پردہ کی بندشوں سے بیزار ہو رہا تھا جو ابھی ابھی عائد ہوئی تھی۔ دوڑنے' درخت پر چڑھنے' آنکھ مچولی اور گولی کھیلنے۔ سبھی دلچسپی کے مشاغل تو ممنوع قرار دے دیئے گئے تھے۔ بس گھر میں بیٹھی گڑیا کھیلو یا روئی کترنوں کے ساتھ سگھڑاپا سیکھو جب کہ امجد کے لئے ہر شرارت جائز تھی۔ پھر یہ بھی یقین تھا کہ اماں بے چاری کے لئے بھی جنت میں یقینی بکنگ ہوجائے گی کہ سن رکھا تھا کہ جس ماں کے دو معصوم بچے فوت ہوجاتے ہیں ان کا جنت میں مقام یقینی ہوجاتا ہے اور یہاں تو تیسری بھی جنت واصل ہونے کے لئے تیار کھڑی تھی۔

جنت میں سدھارنے کا انتظام کرنے کے بعد خیال آیا کہ رمضان کے روزے چل رہے ہیں۔ رمضان کا ذکر آہی گیا ہے تو یہ بھی بتاتے چلیں کہ رمضان کا تصور میری یادداشت میں بڑا "سوندھا سوندھا" ہے۔ مٹی کی بنی ہوئی پورے سائز کی گہری پلیٹیں جنہیں ڈبری کہتے تھے خاص طور پر رمضان میں استعمال ہوتی تھیں افطاری نکالنے کے مقصد کے لئے۔ مسجد میں انہی پلیٹوں میں افطاری بھیجی جاتی تھی اور جو بچے روزہ نہیں رکھتے تھے انہیں اور گھر کا کام کرنے والے سارے اسٹاف کی کھیپ کو بھی؛ نئی ڈبریوں میں افطاری ملتی تھی۔ گھر کے مالکان اور دوسرے روزہ داروں کا دسترخوان علیحدہ لگتا تھا۔ جس میں باقاعدہ چینی یا تام چینی کی پلیٹیں استعمال ہوتی تھیں پھر کوری کوری چھوٹی بڑی صراحیاں کہ روزہ کھول کر ٹھنڈا پانی ملے۔ فرج تو خال خال ہی کہیں ہوتا ہوگا۔ سو اپنی عمر کے جس دور کا ذکر کررہی ہوں فرج نہ دیکھا تھا نہ سنا تھا۔ ہاں گرمیوں میں برف خوب استعمال ہوتی تھی۔ مٹی کی ڈبری میں افطاری' چھوٹی سی دو گلاس کی صراحی اور

آنگن میں چوکی پر چادر بچھا کر سارا سامان رکھ کر اذان کا انتظار! اذان کے ساتھ ہی بڑوں کی مانند ہمارا بھی (ڈبریا) روزہ کھل جاتا تھا۔ سو رمضان کے ختم ہونے سے پہلے اس دنیا سے رخصت ہونے کی کوشش انتہائی بے وقوفی بلکہ ناعاقبت اندیشی تھی اور پھر عید کو بھی ہاتھ سے نہ جانے دینا تھا کہ بچوں کے لئے ان دنوں عید میں بڑی کشش ہوا کرتی تھی چنانچہ ہم نے ایک بار پھر اپنے فیصلہ پر نظرثانی کی اور عید کے پہلے جنت میں جانے کا ارادہ قطعاً ملتوی کردیا اور یہ فیصلہ کیا کہ عید کی گہما گہمی اور خوشی کے دن ختم ہونے کے بعد ہی جنت کا رخ کیا جائے گا کہ اللہ جانے جنت میں اتنی مزیدار عید نصیب بھی ہو کہ نہیں اور پھر چاند رات کی کشش اپنی جگہ۔

انتیس رمضان کو عید کا چاند دیکھنے کی جلدی میں روزہ کھولتے ہی چھوٹے بڑے سب ہی چھت پر دوڑ جاتے۔ بڑے لوگ جو تیس روزے پورے کرنا چاہتے تھے یا وہ خواتین خانہ جن کی عید کے سواگت کی تیاریاں مکمل نہ ہوپائی تھیں وہ تو انتیس کا چاند نظر نہ آنے سے ایک طرح سے مطمئن و شاداں ہو کر چھت سے لوٹ آتی تھیں۔ لیکن بچے لوگ بڑے آزردہ ہوجاتے تھے کہ عید کے کپڑے جوتے رکھے رکھے ایک روز اور پرانے ہوجائیں گے۔ ویسے آج کل کی طرح افراط سے تو نہیں لیکن عید کے نام پر دو جوڑے نئے کپڑے ضرور بنتے تھے۔ ایک چاند رات کے لئے اور ایک اس سے ذرا بھاری عید کے لئے۔ خیر صاحب خدا خدا کرکے روزے اور انتظار کے دن کٹے۔ ہم نے عید کے دن سرخ قمیص اور سبز رنگ کی شلوار پہنی اور اوپر سے دو گز کا دوپٹہ جو سنبھلنے میں نہیں آرہا تھا۔ اماں نے سیدھی مانگ نکال کر چوٹی گوندھ کر موباف ڈالا۔ معلوم نہیں اب یہ موباف کا لفظ استعمال ہوتا بھی ہے یا نہیں یوں سمجھ لیں کہ رنگ برنگے بالوں کے کلپ اور ربن نے موباف کی جگہ لے لی ہے۔ عید بقرعید یا شادی بیاہ کے موقع پر لڑکیوں کے لئے یہ موباف گھروں میں تیار کئے جاتے تھے۔ رنگین ریشمی یا چھینٹ کی لمبی اور تقریباً تین انچ چوڑی پٹی لے کر اس کے چاروں طرف سفید سفید وائل یا ململ کی کلف کی ہوئی ایک انچ پٹی سی ٹانک دیتے تھے اور اسے قینچی سے پتلا

پتلا آڑی شکل میں کاٹ دیا جاتا تھا۔ چوٹی کے سرے پر جب اس موباف کو لپیٹا جاتا تھا تو لگتا جوہی کے اتنے سارے پھول اپنی ساری تازگی اور شگفتگی کے ساتھ اکٹھا کھلے ہوئے ہیں۔

جیسا کہ لکھ چکی ہوں کہ یہ موباف عام طور سے عید بقرعید یا کسی خاص موقع کے لئے تیار کئے جاتے تھے اور عید کے روز ان سے چوٹی کو سجانے کا بڑا اشتیاق اور انتظار رہتا۔ موباف ہی پر کیا موقوف ہے عید کے روز رنگ برنگی کانچ کی چوڑیاں، کانوں کے بندے اور پھر نئے نئے کپڑے اور جوتے! ان بہت ساری دلفریب چیزوں کے علاوہ عید میں ملنے والی عیدی کی خوشی اور اکسائٹمنٹ میں چاند رات کو نیند ہی اچٹ جاتی تھی کہ کہیں صبح اٹھنے میں دیر ہوگئی تو عید کے چند گھنٹے خواہ مخواہ نیند کی نظر ہو کر برباد ہو جائیں گے۔ گھر میں الارم گھڑی تھی کہ نہیں مجھے یاد نہیں لیکن مجھے جتنے بجے اٹھنا ہوتا (اپنا نام لے کر اور اپنے ہمزاد کو تاکید کر کے کہ مجھے اتنے بجے اٹھا دینا) میں سو جاتی۔ میرے ہمزاد نے تب سے لے کر آج تک مجھے دھوکہ نہیں دیا۔ سو آغاز زندگی سے لے کر آج تک جب کہ انجام زندگی کے سرے تک پہنچ چکی ہوں نہ تو میں نے کبھی الارم گھڑی استعمال کی اور نہ کسی دوسرے فرد سے وقت مقررہ پر جگانے کی فرمائش کی۔ بس میرا (یا میری) ہمزاد مجھے حسب منشا وقت پر جگا دیتا ہے۔ عید میں بڑے لوگ اپنے سے چھوٹوں کو (استطاعت اور رشتہ کی مناسبت سے) عیدی دیتے تھے جسے ہم لوگ پربی کہتے تھے یہ لفظ پربی شاید ہندی کے لفظ پرب سے مشتق ہے جس کا مطلب تیوہار ہے حالانکہ عیدی چار آنے سے زیادہ کوئی نہیں دیتا تھا اور اس پربی کی کل رقم چار پانچ روپیہ سے زیادہ نہیں بنتی تھی پھر بھی طفولیت کے اس ناداں دور میں ایسا لگتا تھا کہ "جو دھن ہمارے پاس ہے وہ راجہ کے پاس بھی نہ ہوگا" اور ہاں عید کے دن ہم بچوں کو بڑوں کے مانند پان بھی کھانے کو ملتا تھا جس کا مطالبہ اور تمنا عام دنوں میں ممنوع تھا۔ عیدی کے پیسے سے ہم لوگ بڑھیا کے رنگ برنگے بال بھی خرید کر دل بھر کر کھاتے تھے۔ غلطی کرنے پر بڑوں کی طرف سے ڈانٹ پھٹکار بھی کم ہی ملتی تھی۔ غرض کہ عید

کیا آتی تھی ہر ممکن عیش کے دروازے کھل جاتے تھے۔ (سوائے ڈیوڑھی سے باہر جانے کا دروازہ جو مجھ پر بند تھا سو بند ہی رہتا۔)

عید کے تیسرے دن کہ ابھی عید کا ماحول باقی تھا اور ہم اپنی آخری دنیاوی عید سے جی بھر کر لطف اندوز ہونے میں انتہائی انہماک سے مصروف تھے کہ بڑے بھیا کی سخت ڈانٹ پڑی۔ ہوا یہ تھا کہ ہم کمرے کی کھڑکی کے ساتھ لگے (کھڑکی کھول کر وہاں پر کھڑے ہونا سیانی ہوتی ہوئی بیٹی یا بہن کے لئے عیب کی بات تھی) باہر کا نظارہ کرنے میں محو تھے کہ ایک ہماری ہی عمر کی بچی بازو کے گھر سے نکل کر میرے پاس آکھڑی ہوئی۔ میں زنداں کی دیواروں کے اس پار اور وہ دیواروں سے باہر۔ ہم بچوں کی سی باتیں کرتے ہوئے زور سے ہنس پڑے۔ آواز بھیا کے کانوں تک پہنچی جو مردان خانے میں دوستوں کے ہمراہ ہنسی مذاق اور شور وغوغا کر رہے تھے اور جن کے قہقہوں کی آواز گھر سے باہر گلی تک جا رہی تھی چنانچہ ہماری بے باک ہنسی کی آواز سنتے ہی انھیں میرے راہ راست سے بھٹکنے اور خاندان کی عزت اور تہذیب کے اقدار کا مٹی میں مل جانے کا خدشہ پیدا ہو گیا۔ سیانی بیٹی کے کھلی کھڑکی کے پاس کھڑے ہو کر زور سے ہنسنے کی پاداش میں خاصی سرزنش ہوتی۔ ہم نے اپنی معصومیت میں اپنے طرز عمل کی سنگینی محسوس نہیں کی اور بھیا کی ڈانٹ کا چشمگیں تیوروں کے ساتھ بہت زیادہ برا مان کر فوراً ہی مر جانے کا فیصلہ کر لیا لیکن افسوس کہ جب زہر پینے لگے تو خالی شیشی اوندھی پڑی ملی۔

حیدر آباد دکن میں ۱۹۳۳ء کے اواخر تک رہے۔ پھر ابا (در بھنگہ) بہار واپس آگئے۔ حیدر آباد کے مقابلے میں در بھنگہ بہت چھوٹی سی جگہ لیکن ہمارے لئے ابا کا در بھنگہ آنا بہت مبارک ثابت ہوا۔ حیدر آباد میں ہمارے کوئی عزیز واقارب نہ تھے ابا کے دوستوں اور مداحوں کا حلقہ جو صرف ارباب علم ودانش پر مشتمل تھا۔ عورتوں اور بچوں کے کوئی خاص سماجی مراسم نہ تھے۔ اماں کی ہم عمر آس پاس میں رہنے والی چند خواتین ایسی تھیں جنھیں کھینچ تان کر ہی حلقہ کی تعریف میں لایا جا سکتا تھا۔

دربھنگہ میں ہمارے گھر سے دو قدم کے فاصلے پر بازار تھا۔ وہاں پر علاوہ مختلف اشیاء کی دوکانوں کے علاوہ ایک پرچون کی دوکان (جسے اب ڈپارٹمنٹل اسٹور کہتے ہیں) بھی تھی وہاں سے میرے بھائی نے بالوں میں لگانے کی رنگ برنگی کلپ خرید کرلادی تھی۔ دربھنگہ میں زندگی میں پہلی بار میں نے گھر سے باہر کی دنیا بلا کسی روک ٹوک کے آزادی سے دیکھی اور باہر کی دنیا میں کیا کیا ہاہاکار مچی ہوئی ہے اس کی رپورٹ بھی ابا اور اماں کو دی... کیسے؟ مگر ٹھہریئے! اس کیسے کی تفصیل میں جانے سے پہلے یہ بتاتی چلوں کہ آج جب اتنے طویل برسوں پہلے کی یادداشت کو کرید رہی ہوں تو مجھے شمالی کولمبیا کے ایک غیر متمدن قبیلے کا چار سالہ بچہ یاد آرہا ہے اس قبیلہ کی تہذیبی روایت ہے کہ جس بچہ کو علم ودانش وفراست سے مالامال کرنا ہو یا قبیلہ کا روحانی پیشوا بنانا ہو تو اسے چار سال کی عمر سے دنیاوی دلچسپیوں' رنگینیوں حتی کہ سورج کی روشنی سے بھی محروم کردیتے ہیں۔ پتھر کا گھر اس کی پناہ گاہ ہوتی ہے جہاں وہ اٹھارہ سال تک رہتا ہے۔ اس قبیلہ کا اعتقاد ہے کہ بچہ جس طرح نو مہینے تک ماں کے پیٹ کے اندھیرے میں رہ کر جنم لینے کا اہل ہوتا ہے اسی طرح دھرتی ماں کے بطن میں اندھیرے اور سایہ میں اٹھارہ سال کی مدت گزار کر اسے چشم بینا کی دولت حاصل ہوگی اور تب جب وہ چاند ستارے' سورج اور دوسری مادی اور غیرمادی چیزوں کو سمجھنے اور ماضی اور حال کا ادراک حاصل کرنے کی کوشش کرے گا تو کائنات کے اسرار اس پر آپ سے آپ کھلتے اور واضح ہوتے چلے جائیں گے۔ بہرحال یہ سب تو شاید اساطیری عقائد سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔ لیکن مجھے اس چار سال کے بچہ میں آٹھ سال کی بچی کی جھلک نظر آئی کیا میرے والدین نے بھی مجھے چشم بینا عطا کرنے کا پروگرام بنایا تھا؟

تو اب پھر "کیسے" پر واپس چلتے ہیں۔

۱۹۳۴ء کے جنوری میں بہار میں اور خاص طور پر دربھنگہ میں قیامت خیز زلزلہ آیا۔ رمضان کے مہینے کی آخری تاریخیں۔ گھر میں چھوٹے بڑے سب روزہ سے تھے۔ اماں باورچی خانہ میں افطار کی تیاری میں لگی ہوئی تھیں۔ دوپہر کے ڈھائی یا تین کا

عمل رہا ہوگا۔ یکایک اماں زلزلہ زلزلہ چلاتی ہوئی میرا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتی ہوئی صحن میں لے آئیں۔ چشم زدن میں سارا گھر زمیں بوس ہوگیا۔ اماں اور میں دونوں ہی ملبے کے نیچے۔ پتہ نہیں اللہ کے بحرِ کرم کو مجھ پر ہی کیوں جوش آیا کہ ملبے تلے دبنے کے باوجود بھی ہم نہیں دبے جب کہ ہمارے ہی جیسے بہت سارے بچے جوان بوڑھے اس تین چار منٹ کے قہرالٰہی میں مرگئے یا اکثر زندگی بھر کے لئے مفلوج.... ہمارے ساتھ مشیت ایزدی کی خصوصی مراعات یہ ہوئی کہ برآمدے کے دو ستون دونوں طرف گرے اور اس کے اوپر چھت کا کچھ حصہ جس کی وجہ سے اندر خلاء سا ہوگیا اور ہم اس خلاء کے اندر ہر قسم کی ضرب سے محفوظ اور راستہ ٹٹول کر چشم بینا کے طفیل باہر نکلنے کے لئے آزاد۔ تھوڑی دیر تک تو بے حد خوش ہوتے رہے کہ چلو بھوکم (زلزلہ) بھی دیکھ ہی لیا جس کے بارے میں سنا کرتے تھے کہ دنیا دو گایوں کے سینگ پر کھڑی ہے اور جب گائے سینگ بدلتی ہے تو دھرتی ڈولنے لگتی ہے۔ جی چاہنے لگا کہ گائے کو بھی دیکھ ہی لیتے تو اچھا ہوتا جب اندھیرے اور حبس میں دم گھٹنے لگا تو ہاتھوں کو ادھر ادھر مار کر اور رینگ رینگ کر ملبہ کے ڈھیر سے باہر آئے۔ ابھی گرد و غبار سے کپڑے جھاڑنے ہی لگی تھی کہ اندر سے کسی کے کراہنے کی آواز آئی۔ ارے یہ تو اماں کی آواز ہے ہم جس راستے سے باہر آئے تھے پھر وہیں سے اندر آگھسے۔ کچھ دور رینگنے کے بعد اماں کا پتہ چلا ایک ستون اماں کے دونوں کولہوں پر آگرا تھا۔ اب تک ہماری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ جس طرح ہم باہر آگئے اس طرح اماں کیوں نہیں آرہی ہیں۔

جب زلزلہ آیا ابا اور اور بھیا دوسری منزل کے تخت پر بیٹھے (جسے ہم لوگ کوٹھا کہا کرتے تھے) تلاوت کلام پاک کر رہے تھے۔ آدھی چھت ٹھیک تخت کے برابر سے گر گئی تھی اور دونوں باپ بیٹا تخت سے معلق فضا میں نیچے کی طرف صرف پیر لٹکائے بیٹھے تھے۔ ہم آزاد پنچھی سیڑھی کے ملبہ پر کودتے پھاندتے ابا اور بھیا کو اماں اور آس پاس کی تباہی کی خبر دے رہے تھے۔ یہ دوسرا معجزہ تھا۔ شہر میں ہنگامہ بپا تھا جو لوگ زلزلہ کے وقت گھر سے باہر تھے وہ اپنے اپنے گھروں کی خبر لینے کے لئے بدحواس دوڑ

رہے تھے۔ مجھے لوگوں کی وہ بھیڑ یاد ہے جو سیڑھی لے کر ابا اور بھیا کو لٹکتی چھت سے اتارنے کے لئے آئی تھی۔ کچھ دوسرے لوگ ملبہ صاف کرکے اماں کو نکالنے کی سعی کر رہے تھے۔ لوگ ابا سے التجا کر رہے تھے کہ مولانا دعا کیجئے کہ اللہ اپنے عذاب سے مسلمانوں کو بچائے۔ (یقیناً یہ سب مسلمان ہی رہے ہوں گے) ابا نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے کہ نہیں مجھے پتہ نہیں۔

بچپن کی بے فکری کا عیش مجھے یوں میسر نہ ہوا کہ آٹھ سے اٹھارہ سال کی عمر تک جانے کتنے ہی سنجیدہ موضوعات پر کتابیں اور مضامین پڑھ ڈالے۔ بچپن کا دور زندگی کے سنجیدہ مسائل میں الجھ کر لڑکپن کی ساری شوخیاں اور الھڑپن بھول بیٹھا۔ ابا کے پاس گھنٹوں بیٹھ کر گلستان بوستان، مع ابا کی تفصیلی تفسیر و وضاحت اور شیخ سعدی کی حکایتوں کے ذریعہ نید نصائح پر درس لیتے رہے۔ یہ ابتدائی عمر کی بات ہے۔ اماں نے قرآن شریف ختم کرائی۔ ابا نے عربی پڑھانے کی ناکام کوشش کے باوجود احادیث اور شرح کلام پاک مع معنی و تفسیر خوب اچھی طرح اور اس طرح پڑھائی کہ مذہب کا بہت ہی سیکولر اور عقلیت پرستانہ شعور دماغ پر عمر بھر کے لئے نقش ہوگیا۔ پھر اس پر مارکسزم کی جلا۔ ذہنی طور پر اس خیال یا نظریہ سے منحرف کرنے میں جس کا کیوں اور کیسے اور علت وغایت سمجھ میں نہ آئے اگر کچھ کریڈٹ نیاز فتح پوری کو جاتا ہے تو ابا بھی کچھ کم ستائش کے حقدار نہیں ہیں جنھوں نے سماج کے مطالبوں کے آگے گھٹنے ٹیک کر آٹھ سال کی بچی کو گھر کی چہار دیواری کے اندر مقید کرنے کے باوجود اس کے دل ودماغ کی پرواز کے لئے عقلیت پرستی اور ذہنی نشوونما کے سارے دروازے کھول دیئے۔ مثال کے طور پر ابا نے احادیث اور قرآن شریف تو پڑھائی پر دعا کے بارے میں ایسا فلسفہ میرے سامنے پیش کیا جس نے میری سوچ اور میرے کردار کی کایا ہی پلٹ دی۔ ابا کے خیال میں کسی چیز یا پسند ناپسند خواہش کے پورا ہونے کی تمنا تو فطری امر ہے لیکن ہاتھ پھیلا کر آنچل پھیلا کر یا صرف الفاظ کے ذریعے دعا مانگ کر اللہ کو مشورہ دینا کہ وہ اپنے فیصلے کو میری خواہش یا مفاد کے تابع کردے اللہ کے حضور گستاخی

بھی ہے اور سعی لاحاصل بھی ہے۔ گویا انسان سمجھتا ہے کہ اللہ کا فیصلہ ناقص بھی ہو سکتا ہے جس میں انسانی مشورہ کی مدد سے بہتر ترمیم کی جا سکتی ہے۔ چنانچہ ہزار مصائب اور آزمائشوں کا سامنا کرنے کے باوجود بھی میرے ہاتھ دعا کے لئے کبھی نہ اٹھے کہ بچپن ہی سے عقلیت پسندی کے طفیل ایمان واعتقاد کی جڑیں اتنی مضبوط ہو گئی تھیں کہ ساری عمر دعا مانگے بغیر ہی چٹانوں کے سے عزم کے ساتھ جیون ناؤ کھیتی رہی۔

یاروں نے تو بے حد کوشش کی کچھ مجھ پہ کرم بھی ہو جائے
پر ہم ہی اتنے کاہل تھے کہ دست دعا پھیلا نہ سکے

کم عمری میں ہم نے ڈپٹی نذیر احمد کی مراۃ العروس، بنات النعش، راشد الخیری صاحب کی صبح زندگی شام زندگی اور شب زندگی اور توبۃ النصوح بھی پڑھی، لیکن جتنا باؤلا اور ذہنی الجھاؤ میں مجھے اصغری کے کردار نے ڈالا اور کوئی نہیں کر سکا۔ پھوہڑ پن اور چھوٹے بھائی سے لڑنے جھگڑنے بڑے بھائی سے بدزبانی یا بحث کرنے (وہی اشرف بھیا اور کون؟) یا گھر کا کام کاج اور اماں کا ہاتھ بٹانے میں کوتاہی کرنے پر مراۃ العروس کی آٹھ برس کی تمیزدار بہو یعنی اصغری اور بارہ برس کی مزاج دار بہو اکبری کی مثال مجھے شرم دلانے کے لئے اور اپنے نکھٹو پن کا احساس دلانے کے لئے دی جاتی۔ اس طرح کے فرائض میری پھوپھیاں بڑے احسن طریقے سے انجام دیتی تھیں۔ راشد الخیری کی کتاب "صبح زندگی شام زندگی اور سب زندگی" پڑھ کر نسیمہ کا کردار ایک مکمل ہستی کی مانند ذہن ودماغ پر حاوی ہو گیا اور اس مقولہ کی صداقت پر سے ایمان عرصہ تک کے لئے اٹھ گیا کہ انسان خطا ونسیان کا پتلا ہے نتیجہ یہ ہوا کہ اپنے آپ کو اصغری اور نسیمہ کے قالب میں ڈھال لینے کی بزرگوں کی نمائشی ہدایت اور کچھ کچھ انہیں جیسی مافوق الفطرت صلاحیتیں اپنے آپ میں پیدا کرنے کی تمنا نے کچے ذہن کو خاصی الجھنوں میں ڈالے رکھا۔ مگر بھلا تمنائیں بھی کہیں بر آتی ہیں۔ ویسے یہ ضرور رہا کہ ان ناممکن العمل نصیحتوں اور مثالوں نے اور انہونی تمناؤں نے بچپن کی بے فکری اور سنہرے پن

کے دور کو ملیا میٹ کر دیا۔ اس پر مستزاد یہ کہ مارکس کا کمیونسٹ مینفسٹو اور داس کیپٹل کا اردو میں ترجمہ کیا ہوا کتابچہ ہاتھ لگ گیا اور یوں ذہن کورس کی کتابیں یاد کرنے کے علاوہ مادہ اور ایڈیا کی شاید کبھی نہ حل ہونے والی گتھی کو پورے انہماک اور خلوص کے ساتھ سلجھانے میں لگ گیا۔

ابتدائی دور زندگی کی یادیں سراب کی مانند نہیں بلکہ بتی حقیقتوں اور کھری سچائیوں کے مانند زندگی بھر اور خاص طور پر بڑھاپے کی دہلیز پر کچھ زیادہ ہی ساتھ لگی رہتی ہیں۔

دشت غم دوراں کی راہوں میں اندھیر تھا
بکھری ہوئی یادوں نے انجم کی ضیا لادی

پھر دو سال در بھنگہ میں گزار کر ابا پٹنہ آگئے۔ تیرہ سال کی عمر تھی۔ پہلے کہیں تذکرہ کیا ہے کہ بڑے بھائیوں کے کمروں سے ان کی غیر موجودگی میں طرح طرح کی کتابیں اور رسائل لا کر پڑھا کرتی تھی ایک رسالے کا نام "زمانہ" تھا۔ پھر "نگار ساقی" وغیرہ وغیرہ..... سارے رسائل کے نام تو یاد نہیں ایک ضخیم کتاب یاد ہے جو فلسفہ مذہب سے متعلق تھی جس میں خدائے مطلق کو عقل کل اور شعور اعلیٰ کہا تھا۔ کتاب اردو میں تھی اور کسی دوسری زبان سے ترجمہ لیکن نہ کتاب کا نام یاد ہے نہ مصنف اور مترجم کا۔ جی چاہتا ہے اسے پھر پڑھنے کا۔ بہرحال ایک نظم یاد نہیں کہاں پڑھی اس کے چند بند یاد رہ گئے ہیں اور وہ بھی یوں کہ یہ نظم مجھے بہت اچھی لگی تھی۔ اسے ترنم سے گانے کی تمنا تو نہ تھی لیکن اسی طرز پر لکھنے کی تمنا نے سانپ کے پھن کے طور پر سر ضرور اٹھایا تھا۔ اس تمنا کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش میں اسے کاغذ پر لکھ لیا جس کی پاداش میں اماں سے جھڑکیاں لی تھیں۔ ان کے صرف دو شعر یاد رہ گئے ہیں۔ مصرعہ ہے۔

دوشیزگی کا غازہ رخ پر چمک رہا تھا
کچھ پھول دوش پر تھے دامن لٹک رہا تھا

یہ دوشیزگی کا غازہ تب سے بہت پہلے دل کو بھایا تھا جب دل میں مہمان بسانے کی آرزو نے انگڑائی لی تھی۔ بہرحال سرزنش تو دونوں ہی بار ہوئی لیکن تھا یہ بیچ بیچ میں ناسمجھی اور الڑھپن کا دور کہ سوچتے سوچتے تھک گئی کہ اس نظم کو کاغذ پر اپنے ہاتھوں سے لکھنے میں کیا غلطی کی تھی کہ دامن ہی کیا اس وقت تک تو دوپٹہ اور اکثر منہ بھی بات بے بات ڈانٹ اور نصیحت سننے پر لٹکا رہتا تھا۔

چنانچہ پہلی بار جب وہ کاغذ اماں نے پھاڑ کر کھا جانے والی نظروں سے میرے سراپا کا جائزہ لے کر پھاڑ کر پھینک دیا کہ کہیں ابا کی نظر پڑ جاتی تو غضب ہی ہو جاتا تو ہم نے بڑی ہمت کر کے دوبارہ انہی خیالات و تاثرات کا تانا بانا اکٹھا کیا اور چپکے چپکے اپنی دانست میں اقبال کے ان اشعار کے طرز پر

سہانی نمود جہاں کی گھڑی تھی
کہ خود نا خوشی مست جام خوشی تھی

تک بندی کر کے اپنے سے بڑے بھائی علی احسن کو تعریف اور اصلاح کے لئے دکھائی۔ یہ شاعری بھی کرتے تھے اور مجھے بہت پیار کرنے کے علاوہ میرے بڑے ہمدرد تھے۔ ان سے اصلاح لے کر اور اپنے راز میں شریک کر کے نہ ڈانٹ کا ڈر تھا نہ معتوب والدین ہونے کا جیسا کہ کہا کہ وہ خود بھی شاعری کرتے تھے لیکن ہوا یہ کہ میری شاعری پڑھ کر بغیر کسی تبصرہ کے کاغذ کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے اور معصوم اور مظلوم سی مسکراہٹ لبوں پر لا کر سرگوشی میں بولے "ابا سے پٹنے کا ارادہ ہے کیا؟ اب کبھی ایسی حرکت بھی مت کرنا" یہ حادثہ اسکول میں داخلے سے پہلے کا ہے۔

ساری انقلابی اور سوچ کی باغی لہریں دماغ کے اندر ہی نشوونما پاتی رہیں۔ ۱۹۴۱ء میں کل ہند خواتین کانفرنس نے رائے کمیٹی کے تعاون سے پورے ملک کا دورہ کیا اور

خواتین کے حقوق اور مسائل ان کی سماجی اور سیاسی پسماندگی کا جائزہ لے کر اسباب کی کھوج لگانے کی سعی کی۔ رجعت پرست طبقہ کی طرف سے ان کوششوں کو خاصی مخالفت اور مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ خواتین کانفرنس کی کارروائیاں اور اخباروں میں ان کی خبریں پڑھ پڑھ کر دل بہت مچلتا تھا کہ کاش ہم بھی اس کاروان میں شامل ہوتے اور دل پر گہری چوٹ تب لگی تھی جب کیونسٹ پارٹی کی خواتین کی کارگزاریوں کی رپورٹیں پڑھتے۔ احساس کمتری اور احساس محرومی سے اپنا وجود دبتا سکڑتا محسوس ہوتا۔ اب بائیں بازو کی خواتین نے عملی سیاست میں حصہ لینے کے علاوہ پردہ اور چہاردیواری کے خلاف بھی جدوجہد شروع کی۔ احتجاج کا سب سے موثر طریقہ مظاہرہ یا مارچ ہوتا تھا۔ ان جلوسوں میں لگائے گئے نعروں سے نہ صرف عورتوں کو ان کے روز مرہ کے مسائل کی واقفیت اور شعور بیدار ہوتا تھا بلکہ مردوں میں بھی سماجی بیداری پھیلتی تھی اور میری یہ حالت کہ جیسے جیسے عورتوں کے آگ کی مانند پھیلتے ہوئے عزائم کی خبریں ملتیں اپنا وجود خاک میں ملتا ہوا محسوس ہوتا۔

ہماری اپنی نشوونما بحیثیت مجموعی ترقی پسندانہ ماحول یا رجعت پرستی کے زیر سایہ ہوئی' اس کا حتمی فیصلہ کرنا خود میرے لئے بھی مشکل بلکہ ناممکن سا ہے۔ اگر ایک طرف آٹھ سال کی عمر سے دنیا گھر کی چہار دیواری تک محدود کردی گئی تو اسکول میں پڑھنے کی وجہ سے کچھ کھلی ہوا اور کھلا ماحول بھی میسر ہوا۔ اسکول سے اساتذہ کی زیر نگرانی جب لڑکیوں کی پکنک پارٹی سیرو تفریح کے لئے مختلف مقامات پر جاتی تھی تو مجھے ان کے ساتھ جانے کے لئے گھر سے اجازت ملنے میں کوئی دشواری نہ ہوتی پھر انٹلیکچوئل اور ذہنی ماحول تو اتنا ہی زیادہ سازگار رملا کہ بظاہر قدامت پرست گھرانے کی پروردہ لڑکی کو اتحاد اور ایمان دونوں نظریوں کا تقابلی موازنہ اور مطالعہ کرنے کا شوق اور سہولت خود ابانے بہم پہنچائی۔ میرا یقین ہے کہ ہر انسان کی شخصیت' طبیعت' مزاج اور زندگی کے آلام و آسائشوں کی طرف اس کا رویہ سیاست اور سماج سے سمجھوتہ یا ٹکراؤ...... سبھی کے پیچھے منظم اور متواتر واقعات وحادثات کا ہاتھ ہوتا

ہے۔ قوموں اور ریاستوں بادشاہوں حکمرانوں کے حوالے سے ہم انہیں تواریخ عالم یا تواریخ اقوام کا نام دیتے ہیں اور انسانی عروج و زوال کے اسباب کا تواریخ کے ذریعے کھوج لگاتے ہیں۔ چھوٹے پیمانے پر خاندان' سماج اور ماحول افراد کے تشخص افتاد طبع۔ اور کردار کا انفرادی سطح پر تعین کرتے ہیں۔ کبھی کبھی ماضی کے روزن سے جھانکنے کی کوشش کروں تو ہر بدلتے لمحہ کے ساتھ ایک نئی لڑکی کی شبیہہ ابھرتی ہے۔ منہ پھٹ' زبان دراز' بات بات پر بحث کرنے والی' ایک بار اماں نے کھلے سراپا کے سامنے جانے پر سمجھایا تو میں نے تڑ سے کہا بھیا کو کیوں نہیں سر ڈھانپنے کو کہتی ہیں۔ ایک بار چاول چن کر اس میں سے کنکر نکالنے کو دیا گیا تو میں نے کنکر چنے تو ضرور مگر پھر انہیں چاولوں میں ملا دیا۔ بھلا مردوں کے حصے کا کنکر میں کیوں چنوں! بھیا تو باہر کبڈی یا گلی ڈنڈا کھیلیں اور میں ان کے نوالے کے کنکر چنوں! اماں کو پھر نئی فکر نے ستانا شروع کر دیا۔ ہائے اس لڑکی کا سسرال میں نباہ کیسے ہوگا؟ میں نے دل میں کہا نباہ کرنا ہی کسے ہے انہیں تو کنکر کے بجائے لوہے کے چنے چبانا ہوں گے۔

دوسری منزل

حق رائے دہندگی اور شادی - احتجاج اور عزم

ایک تو کریلا اس پر سے چڑھا نیم۔ ایک تو فطرتاً" بچپن ہی سے عزم کی پکی اور اس پر سے سونے پر سہاگہ یہ ہوا کہ دس سال کی عمر سے ہی باغیانہ تحریریں اور پھر کمیونسٹ لٹریچر پڑھنے کو ہاتھ لگ گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اماں کی نرالی بیٹی کے ڈھپ بالکل ہی بے ڈھب ہو کر رہ گئے تھے۔ وہ تو اللہ نے فضل کیا کہ حبیب سے شادی ہوئی ورنہ کسی اور شوہر اور سسرال سے تو شاید چار روز بھی نباہ نہ ہو پاتا اور ذرا سوچنے کی بات ہے کہ نباہ نہ ہوتا تو ایک اٹھارہ سال کی سماج کی غیر منصفانہ ریت رسم کو ٹھکرا کر بغاوت کرنے والی لڑکی کا آج سے پچپن سال پہلے کے قدامت پرست معاشرے میں کیا حشر ہوتا۔

ہمارے خاندان کا جو سماجی حلقہ تھا اس میں بہار کے شرفاء کے عام معیار کے مطابق خواتین اسکول کالج کی تعلیم یافتہ تو نہ تھیں لیکن قرآن شریف، حدیث اور اردو پڑھنے لکھنے پر کام چلانے بھر عموماً" عبور ہوتا تھا۔ ویسے شرفاء کے ایسے بھی

خاندان تھے جہاں لڑکیوں کے "لکھنا" سیکھنے پر پابندی تھی کہ بیٹی ذات کو لکھنا آجائے گا تو اس کا غیر لڑکوں سے خط وکتابت شروع کر کے راہ راست سے بھٹک جانے کا خطرہ ہے۔ جس طرح چند سال قبل پاکستان کے کسی ہائی کورٹ نے یہ فیصلہ دیا تھا کہ اگر عورتیں اپنی پسند سے شادی کرنے کی مجاز ہو گئیں تو روزانہ شادی کریں گی اور طلاق لیں گی۔ البتہ کبھی کبھی مروجہ شرافت کی اقدار سے ہٹ کر بھی لڑکیاں اپنے طور پر لکھنا سیکھ لیتی تھیں جیسے میری اماں۔ اردو پڑھنے کی خاصی استعداد انہوں نے حاصل کر لی تھی۔ پڑھنا تو سیکھا سو سیکھا ہی مگر گھر والوں سے چھپ چھپا کر اچھی طرح لکھنا بھی سیکھ لیا اور اور جب یہ بھید بدقسمتی سے نانا ابا پر کھلا تو شاید اس خدشہ کے پیش نظر کہ کہیں بیٹی غیر محرموں کو خط لکھ کر برادری اور سماج میں بدنامی کا باعث نہ بنے اپنی معصوم چھوٹی سی بیٹی کو خیر زہر کا پیالہ تو نہیں پلایا مگر اپنی ہی عمر کے داماد سے شادی کر دی اور بھلا اس میں نانا ابا کو موردِ الزام ٹھہرانے کی کیا بات ہے۔ ایسا تو آج بھی ہوتا ہے پچھتر اسی سال پہلے ہوا تو کون سی انوکھی بات ہو گئی۔

ہماری نسل تک آتے آتے حالات خاصے بدل چکے تھے۔ صوبہ بہار میں' میں پہلی لڑکی مسلمان تھی جس نے میٹرک گورنمنٹ گرلز ہائی اسکول سے پاس کیا۔ پردہ کی پابندی کے باوجود ہمارے یہاں نزدیکی مرد رشتہ داروں پر اس کا اطلاق نہ ہوتا تھا۔ ویسے سیانی بیٹیوں کو تو دور کی رشتہ دار عورتوں سے بھی پردہ نہیں تو لحاظ تو کرنا ہی پڑتا تھا۔ خیر یہ تو ظاہر ہے کہ ماں باپ کے گھر میں ذہنی نشوونما بڑے باغیانہ نظریات کے چھترچھایا تلے لیکن خاصے رجعت پرست ' سماجی' اخلاقی اقدار اور تمام تر مروجہ روایتی بندھنوں کے ساتھ ہوئی اور یہ بھی بڑا غنیمت ہوا ورنہ اگر دقیانوسی کلچر کی سماجی اور اخلاقی بندھنوں کو پھلانگنے کی سہولت اور آزادی یا ہمت بھی ناپختہ عمر میں مجھے حاصل رہی ہوتی تو نسائی اناؤں کی کمزوریوں کا کب کا شکار ہو کر تباہ و برباد ہو چکی ہوتی اور آج کے دور کی فیمنسٹ تحریک کا جو گلوبل تقاضہ اور مطالبہ ہے اس کی پورے شد و مد کے ساتھ علم بردار ہوتی بلکہ مجھے تو اپنے بارے میں یہ بھی حسن ظن

ہے کہ شاید ساری فیمنسٹ تحریک کی ہراول دستہ کے قائد کی حیثیت سے رہنمائی
رہی ہوتی۔ مجھے یاد نہیں کہ بچپن میں میری کوئی بھی منفی ضد یا ہٹ دھری اماں
نے محض اس لئے پوری کی ہو کہ لاڈلی اکلوتی بیٹی کا دل کیسے توڑیں اور ابا کے سامنے
ننگے سر جانے کی ہمت نہ تھی' ضد کرنا تو اپنی شامت ہی کو نوید دے کر بلانا تھا۔
اس زمانے میں لڑکیوں میں ٹیڑھی مانگ نکالنے کا فیشن چلا ہوا تھا۔ میں نے بھی ایک
بار بڑی ہمت کرکے ٹیڑھی مانگ نکال لی۔ اماں کی نظر پڑی تو بولیں تو کچھ نہیں لیکن
بڑی ٹیڑھی نظروں سے گھور کر جو دیکھا تو فیشن پرستی کے اس شوق سے بھی ہمیشہ کے
لئے تائب ہو گئی۔

ادھر کچھ دنوں سے یا یوں کہئے کہ میٹرک کا نتیجہ آنے کے بعد سے گھر میں
میری منسوب اور شادی کا چرچا بہت زور وشور سے ہونے لگا تھا۔ اس زمانہ میں
لڑکیاں اپنی شادی کے معاملہ میں کچھ رائے دینے یا پسند یا ناپسند کا اظہار کرنے کی
بالکل مجاز نہ ہوتی تھیں۔ صحیح معنوں میں بابل کے گھر میں بندھی گائے کی حیثیت ہوتی
تھی لیکن اصولی طور پر میرے ابا اس معاملے میں بڑے روشن خیال ہوا کرتے تھے۔
چنانچہ لڑکیوں کی پسند ناپسند معلوم کرنا ان کے نزدیک ضروری تھا ویسے یہ معمہ میں
اب تک حل نہ کرپائی کہ عورتوں اور لڑکیوں کے حقوق کے بارے میں ان کی سوچ
اتنی متضاد کیوں تھی۔ کہاں تو چھوٹی سی بچی کو گھر کی چہار دیواری میں مقید کردیا اور
اب شادی کے لئے اس کی منشا معلوم کرنا کہ فلاں لڑکا تمہیں پسند ہے کہ نہیں؟
ارے پسند ناپسند کا سوال ہی کہاں! میں نے تو بھائیوں کے علاوہ کسی دوسرے لڑکے کو
نہ دیکھا نہ ملی تھی۔ ایک دن جب ہم حسب معمول کورس کی کتابوں میں کھوئے
ہوئے تھے کہ میری بھابی شرارتی انداز میں کھلکھلاتی مسکراتی آئیں "توری نسبت
آئی ہے شفیع داؤدی صاحب کے بیٹا سے...... ابا کہن ہیں کہ تورے سے پوچھ لیا
جائے۔ ہاں یا نہیں کہنے کے بجائے" ہم خاموش رہے رائج الوقت معیار شرم وحیا
کے مطابق۔ ایک کنواری لڑکی کو ایسے موقع پر خاموش ہی رہنا چاہئے تھا۔ بھابی پھر

بولیں شفیع داؤدی صاحب کے یہاں عورتیں پردہ نہیں کرتی ہیں تو دے بھی تو پردہ ناپسند ہے ناں" اب ہم حیران کہ جس لڑکے کو ہم بالکل جانتے نہیں اس کے بارے میں میری پسند ناپسند کا سوال چہ معنی دارد! اب کیا ابا میرا سارا پردہ بالائے طاق رکھ کر مجھے کسی لڑکے سے کورٹ شپ کا موقع دیں گے۔ مگر یہ بات صرف دل میں آئی زبان پر نہیں۔

بھابی نے مولانا شفیع داؤدی صاحب کی رَوشن خیالی کا حوالہ دیا تھا لیکن میرے نقطہ نظر سے وہ مذہبی لحاظ سے متعصب انسان تھے اور ان کا سیاسی اور نظریاتی امیج بھی میری نظروں میں بڑا مایوس کن تھا۔ تو پھر ان کے صاحبزادے صاحب بھی انہی جیسے رجعت پسند یا جماعت اسلامی کے چیلا ہوئے تب! پردہ نہ کرنا آزاد خیالی تو ہو سکتی ہے لیکن روشن خیالی نہیں۔ دل ہی دل میں خوب پیچ و تاب کھاتے رہے کہ ابا بھی لڑکیوں کی آزادی اور حقوق نسواں کا یوں رسمی اور نمائشی استعمال کرنے لگے۔

عورتوں کی غلامی مردوں کی زیادتی اور حقوق و آزادی نسواں کے چرچے بہار میں آج سے ساٹھ ستر سال پہلے بھی تھے۔ جہاں تک عورتوں کا سوال ہے ان میں جذبہ بغاوت نے اب تک جنم نہیں لیا تھا۔ احساس مظلومیت مثبت طور پر جنم لے رہا تھا اور روشن خیال مردوں کی معاونت بھی محدود حد تک خواتین کو حاصل ہو رہی تھی۔ ویسے منزل کا تعین یا تصور واضح نہ تھا یوں بھی جمود کا ٹوٹنا بذات خود خوش آئند اقدام ہوتا ہے اور یقیناً تھا۔ پڑھی لکھی عورتوں میں شمار ہونے کے لئے اسکول کالج کی تعلیم کے بجائے اردو لکھنے پڑھنے کی استعداد کافی تھی۔ پردہ کی پابندی تھی مگر نزدیکی رشتہ دار مردوں پر اس کا اطلاق نہ ہوتا تھا۔ لیکن غیر شادی شدہ لڑکیاں اس سہولت سے محروم ہوتیں۔ اماں ان پابندیوں کی دل سے حامی تو نہ تھیں لیکن مصلحت کی بنا پر ان کو برتنے پر زور ضرور دیتی تھیں۔ آخر تو لڑکی کی شادی اسی سماج برادری میں کرنی تھی۔ پٹاخہ کی طرح بنی ہر آئے گئے سے بے تکلفی سے بات کرے

گی تو پھر سارے شہر میں چرچا نہ ہو جائے گا کہ مولانا علی اصغر صاحب کی بیٹی اسکول میں پڑھ کر بالکل ہی ندیدہ ہو کر رہ گئی ہے۔ صرف اسکول کی گاڑی پر پردہ لگا کر جانے سے کیا ہوتا ہے۔ ابا کو ان چھوٹی چھوٹی باتوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی بڑی لگن سے وہ ہمیں بچپن سے بی۔اے تک فارسی پڑھاتے رہے۔ (عربی بھی پڑھانے کی کوشش کی مگر میں نے کامیاب نہ ہونے دیا) اور اسی دوران موقع موقع سے آزادی نسواں کے موضوع پر اپنے خیالات سے میری رہنمائی کرتے رہے۔

میرے ابا کا کہنا تھا کہ اپنی غلامی جہالت اور مظلومیت کی ذمہ دار خود خواتین ہیں۔ انہوں نے اپنی حرکات کی وجہ سے اپنے آپ کو مردوں کا غلام بنا رکھا ہے۔ اگر بفرض محال غلام بنانے کا الزام مردوں پر جاتا بھی ہے تو یہ صرف اس لئے ایسا ہوا کہ عورتوں نے اپنی خوشی اور مرضی سے اپنے آپ کو ظاہری اور نمائشی سنگھار یعنی زیوروں سے لاد لیا اور اصلی یعنی علم و دانش کے زیور سے محروم ہو کر مردوں کے زیر سایہ آرام اور تحفظ کی زندگی کو ترجیح دی۔ اسی تعلیم کا اثر تھا کہ عقلی دلائل کی روشنی میں، میں ملا کی فرسودہ اور غیر اسلامی شریعت سے بہت کم عمری میں ہی منحرف ہو گئی تھی۔ جب کہ سماجی اور معاشرتی بیڑیوں اور نا انصافیوں سے عملاً " بغاوت کی ہمت نہ پیدا کر سکی کہ ماں باپ کو مایوس کرنا اور سماج میں ان کی ناک کٹتے دیکھنا گوارہ نہ تھا۔ میں نے کہیں ذکر کیا ہے کہ آٹھ سال سے کچھ کم و بیش عمر رہی ہو گی کہ پردہ کی پابندیاں لاگو کر دی گئی تھیں جو مجھے ناگ کی طرح ہر وقت ڈستی رہتی تھیں۔ لیکن جس طرح اسکول میں نام لکھوانے کے لئے میں نے بارہ سال کی عمر میں بھوک ہڑتال کی تھی اور ابا سے اپنا مطالبہ منوا لیا تھا اسی طرح کا احتجاج میں نے الفاظ یا کسی اور رویے سے کبھی پردہ کی پابندیوں کے خلاف نہیں کیا تھا۔ شاید ضرورت ہی محسوس نہ کی کہ اسکول کے ہر فنکشن، پکنک وغیرہ میں حصہ لینے کی اجازت گھر سے ہمیشہ ملتی رہی۔

خیر آمدم بر سر مطلب کہ ہمارے صف اول کے شرفاء کے خاندان کی کنواری

بیٹی ہونے کے ناطے میں نے شادی ہونے تک اتنا بھرم تو سماج کی فرسودہ روایات کا رکھ لیا کہ بظاہر کسی کو انگلی اٹھانے کا موقع نہیں ملا اور وہ وقت آگیا جب اکلوتی بیٹی بھی والدین کے سر کا بوجھ تو نہ بنی لیکن اس کے مستقبل کی فکر درد سر بننے کی دھمکی ضرور دینے لگی۔ ادھر مجھے اپنے آپ پر اعتماد بھی تھا اور ذہنی فیصلہ بھی تھا کہ میں مجازی خدا کی حیثیت سے کسی شوہر کو قبول نہیں کروں گی۔ ابا نے کم از کم زبانی سبق تو یہی پڑھایا تھا کہ عورتیں اپنی نااہلیت کی بنا پر شوہر کو اپنا مجازی خدا ماننے پر مجبور ہوجاتی ہیں، اور میں تو انٹر کی طالبہ اور سائنٹفک سوشلزم کی پرستار تھی۔ پھر ریاست اور خاندان کی (Origin of State and family) میں یہ بھی پڑھ رکھا تھا کہ ریاست اور خاندان کی بنیاد ہی محنت کشوں اور عورتوں کے استحصال پر ہے۔ فطرت کا تضاد یہ تھا کہ یہ ہمت نہ تھی کہ شادی کرنے سے ہی انکار کردوں۔ جذباتی اور ذہنی طور پر میں نے یہ قبول رکھا تھا کہ شادی تو ہونا ہی ہے اور اسی مرد صنف سے ہونا ہے جس میں اپنے اولین گناہ کی ذمہ داری تسلیم کرنے کی ہمت نہیں تھی اور جس نے حوا کے کندھے پر رکھ کر بندوق چلائی تھی بلکہ میں سوچتی تھی کہ شادی جس سے ہونا ہے ہو ہی جانا چاہئے کہ ایک طرف تو والدین کو میری رکھوالی کے تردد سے نجات ملے اور دوسری طرف میں بھی اپنی طاقت پرواز کو بیانگ دہل آزما سکوں۔ چند مفروضے ایسے تھے جو ذہن نے قبول کر رکھے تھے کہ انہیں تو حقیقت کا روپ دھارنا ہی ہے۔ جیسے شادی کا ہونا۔ میں نے کہیں تذکرہ کیا ہے کہ میں بہت ضدی اور خود دار لڑکی تھی۔ خودداری کو ٹھیس اس وقت لگتی جب یہ احساس ہوتا کہ بھائیوں کے مقابلے میں مجھے گھر سے باہر بھاگنے دوڑنے کی کی آزادی اور اجازت نہیں ہے۔ ضدی ہونے کا ایک ہی فائدہ ہوا کہ ابا کو میرا نام اسکول میں لکھوانا پڑا۔

یہ بھی آج تک میرے لئے ایک معمہ ہی رہا کہ طبیعت اور مزاج میں سرکشی اور سماجی پابندیوں سے ٹکرانے کا جذبہ کیوں نہ پیدا ہوا۔ ہماری جس دور میں شادی

ہوئی اس زمانے میں بہار میں رسم تھی کہ نکاح کے بعد دلہن کو سجا کر کوئی خاتون اسے گود میں اٹھا کر شادی کے منڈپ میں لا کر بٹھا دیتی تھی دلہن سکڑی سکڑی آنکھیں بند کئے گھٹنے پر ٹھوڑی ٹکائے بیٹھی رہتی تھی۔ اسی وقت آرسی مصحف اور جلوہ کی رسم ہوتی تھی۔ دولہا کو پہلی بار گھونگھٹ کے اندر آئینہ میں دلہن کا مکھڑا دکھایا جاتا تھا۔ دلہن کی آنکھیں تو اس وقت بند ہوتی تھیں۔ جانے کب پہلی بار اپنے خدائے مجازی کو دولہا کے روپ میں دیکھتی تھی۔ میں نے تو اسی روز دیکھا تھا لیکن خدائے مجازی کے بجائے زندگی کے پہلے اور آخری حبیب کی حیثیت سے....!

تو میں یہ بتانا چاہتی تھی کہ میرے ابا اور ان کے زیر اثر اماں ماڈرن تو نہ تھے لیکن بہت زیادہ عقل پرست اور بیدار مغز یقیناً تھے۔ اپنے طرز عمل سے ان لوگوں نے ہر ممکن کوشش کی کہ ان کے گھر میں جاہلانہ رسم و رواج کو نہ برتا جائے اور شاید اسی وجہ سے مجھے سرکشی کی ضرورت پیش نہ آئی۔ میرے ابا کا کہنا تھا کہ دلہن کو گود میں اٹھانے کی رسم یادگار ہے۔ اس دور کی جب راجہ مہاراجہ حملہ آور بارات کی شکل میں لڑکی کے گھر دھاوا بول کر اسے زبردستی اٹھا لے جاتے تھے۔ دلہن سے آنکھ بند کرانے کا مفہوم یہ ہے کہ شوہر کے ساتھ زندگی شروع کرنے سے پہلے لڑکی اپنے گرد و پیش سے لاعلم اور علم و عقل کا دریچہ اپنے آپ پر بند کر لے کہ اب اسے شوہر کے حکم کی تعمیل آنکھ بند کر کے کرنی ہے۔ چنانچہ اسی معاشرے میں جب آج سے نصف صدی پہلے میں دلہن بنی تو نہ مجھے گود میں اٹھایا گیا اور نہ آنکھیں بند کرائی گئیں۔ قدامت پرستی اور رسوم کی بات کروں تو آج مشکل ہی سے کسی کو یقین آئے گا کہ مجھے ایک روز کے لئے بھی ابٹن لگا کر پیلا کپڑا پہنا کر مایوں نہیں بٹھایا گیا۔ کل لڑکی کی بارات آرہی ہے، گھر میں مہمان بیویاں جمع ہیں اور زہرا بیگم (حال زہرا داؤدی) مگدھ مہلا کالج گئی ہیں کہ آج ہی نئے نئے داخلے کے بعد کلاس کا پہلا دن ہے شام کو گھر واپس آئی تو بھابیاں اور تقریب میں شرکت کرنے والی خواتین تھو تھو کرنے لگیں کہ کیسی بے حیا ہو جی تم! کل بارات آرہی ہے اور آج باپ بھائی

کے سامنے بے شرمی سے گھوم رہی ہو۔ خاک سہری چڑھے گی۔(دولہنا پے کا روپ)
صرف اماں ہیں کہ اپنی مدھم مدھم پیاری پیاری مسکراہٹ بکھیرے جا رہی ہیں منہ سے کچھ بول کر نہ دیں لیکن ن ، ان کے ذہنی طور پر کتنی نجات شدہ بیٹی پروان چڑھائی ہے۔ ہماری شادی یعنی ۱۹۴۰ء ۔۵۰ کی دہائی تک بہار میں لڑکی ہفتوں تک مایوں بٹھائی جاتی تھی۔ اس دوران کم سے کم نہانا اور کپڑے بدلنے پر پابندی مردوں میں غیر یا رشتہ دار تو رشتہ دار اپنے باپ بھائیوں کی بھی نظر نہ پڑے۔ ہر روز منوں کے حساب سے ابٹن ضرور ملے جاتے تھے کہ لڑکی پیلا (سوگوار نہیں) اور مہکتا ہوا حسن لے کر نئی زندگی اور خدائے مجازی کے حضور جائے۔

پتہ نہیں اللہ میاں کی کون سی مصلحت پوشیدہ تھی یا وہ کون سا عبرت ناک سبق یا سزا۔ مولانا علی اصغر صاحب اور میری معصوم ماں کو دینا چاہتے تھے جو آج سے سات دہائی عرصہ قبل اس خاکی پتلی کو اماں ابا کی گود میں لا پھینکا جو کہنے میں تو ساری اولاد آدم کے مانند آب و گل ہی کے خمیر سے بنائی گئی تھی لیکن جس کا ذہن مٹی پانی سے سمجھوتہ نہ کر سکا اور شروع ہی سے آتشی رہا کہ اجنہ نظروں سے روپوش اپنی کارستانیاں دکھاتے ہیں۔ مگر جو دل و دماغ آتش سے تعمیر ہوا ہو وہ کہاں کسی مقام پر چوکنے والا ہے جب سے "بہشتی زیور" ممانعت کے باوجود چھپ چھپا کر پڑھنا شروع کیا۔ خون کھولانے کو ایک موضوع ہاتھ آگیا تھا ایک تو یونہی کون کم بارگاہ الٰہی کے دربار میں شکوہ تھا کہ مردوں کو عورتوں پر کیوں فوقیت دی۔ اس پر سے طرفہ تماشہ یہ دین مہر کا قصہ یہ تو صریحاً" عورت کی کھلم کھلا خرید و فروخت کا ذریعہ ہے۔ یہ پڑھ کر تو تن بدن میں آگ سی لگ جاتی تھی کہ اگر طلاق زن و شوہر کے تعلقات پیدا ہونے سے پہلے واقع ہو تو' دین مہر کا صرف ایک ہی حصہ شوہر پر واجب الادا ہوگا۔ ساری اصلاحی مذہبی کتابوں میں پڑھتے تھے کہ دین مہر شرعی ہونا چاہئے لیکن ابا کے خیال میں یہ نہیں ہونا چاہئے تاکہ اگر کسی وقت عورت سے شوہر کا سہارا چھن جائے تو عورت کو کم از کم مالی استحکام تو حاصل ہو مگر اس شعلہ نفس ہستی کو جو شادی کے پہلے تک

چندا کہلاتی تھی نہ اس استدلال سے اتفاق تھا نہ اس سے' نان نفقہ اور دین مہر والی بات تو سرے سے عورت کے وقار کے منافی۔ بھئی جب بکنا ہے تو بندھی بندھائی رقم کے عوض ایک بار کیوں بکا جائے۔ مانگ کے مطابق کیوں نہ خود ہی ہر رات اپنی قیمت طے کی جائے توبہ توبہ کیسی گناہ کی بات کرتی ہوں۔ ہر رات تو طوائفیں اپنے آپ کو بیچتی ہیں مگر یہ دین مہر والی بات پلے نہ پڑنی تھی نہ پڑی۔

جانے کیوں اپنے پیاروں' عزیزوں بزرگوں اور سرپرستوں کو ناراض کر کے ان کو مایوس کر کے ان کے دلوں کو دکھی اور لاچار کر کے بغاوت کرنے کا حوصلہ اور ہمت نہ ہم میں تب تھی جب ہم آتش فشاں کے دہانے تھے اور نہ کبھی بعد میں ہوئی اس ستی میں افتاد مزاج نے سمجھوتہ بازی شاید یوں سیکھی کہ اماں میری نظروں میں بڑی معصوم اور مظلوم تھیں اور اپنی ماں کو اپنی کسی حرکت سے صدمہ پہنچانا مجھے گوارہ نہ تھا۔ ابا سخت مزاج اور زمانہ کی روش اور لوگوں کے بہکاوے میں آ کر پردہ کے معاملہ میں کٹر تھے لیکن وہ ہمیشہ فارسی پڑھاتے وقت خصوصاً گلستان بوستان کے شیخ سعدی کے ذریعے یہ پیغام مجھ تک پہنچاتے رہتے تھے کہ عورتوں کا درجہ فطری طور پر نیچا نہیں ہے بلکہ عورتوں نے یہ غلامی خود اپنے اوپر لادی ہے۔ مردوں نے سونا چاندی پہننا اپنے لئے ممنوع قرار دیا ہے جب کہ عورتوں نے سونا چاندی کی ہتھکڑی' بیڑی' ناک کی نکیل کو بجائے علم کے اپنا سنگھار بنالیا۔ بارات سے چند روز پہلے میں نے اماں سے کہا کہ ابا سے کہہ دیجئے کہ نکاح میں دین مہر نہ رکھوائیں۔ "پگلا گئی ہو بیٹا تب نکاح کیسے ہوگا۔" اماں بوکھلا کر بولیں۔ تب اتنا کہہ دیجئے کہ ابا جس سے اور جس دین مہر پر چاہیں نکاح کردیں میں نے اپنی منظوری نکاح کے ایک روز پہلے دے دی۔ رسمی طور پر نکاح کے وقت کوئی میری اجازت لینے گواہوں کے ساتھ نہ آئے۔ میں نے اپنی زندگی میں دوسری بار اپنی ماں کا دل ٹوٹنے سے بچالیا تھا اور اماں ہی کیا جانے سارے کے سارے سماج کا کیا کیا نہ ٹوٹ جاتا اگر جو مجھ میں ذرا سی ہمت ہوتی اور دین مہر اور نان نفقہ کے بغیر نکاح پڑھوانے پر اڑ جاتی۔ سو اماں نے ابا کو جانے

کس کس جتن سے میرا پیغام پہنچایا کہ نکاح کے وقت کوئی قاضی مجھ سے ہاں کہلوانے نہیں آئے۔ ابا کی تاویل یہ رہی کہ باپ لڑکی کی منشاء جانتے ہوئے اس کے نکاح کی اجازت دے سکتا ہے۔ سماج اور دنیا کی نظروں میں، میں اپنے شوہر کے ہاتھوں بکی تو ضرور لیکن بولی کتنے پر لگی مجھے آج تک معلوم نہ ہو سکا۔ اور کمال تو یہ ہے کہ شادی ہماری رہی بڑی کامیاب بلکہ کامیاب ترین شادیوں کے سلسلے میں ہماری خوشگوار ازدواجی زندگی کی مثال دی جانے لگی۔ جانے اس معجزہ کے رونما ہونے میں ہماری آتش فشاں بزدلی اور سمجھوتہ بازی کا اعجاز تھا یا حبیب کے ٹھنڈے متوازن اور نیک نفسی کا سحر کارفرما تھا۔

جب حبیب ختم ہوئے اور ان کا آخری دیدار مجھے کرایا گیا تو مجمع میں سے پے در پے آوازیں آتی رہیں کہ دین مہر معاف کردو۔ میں نے اس قیامت کے لمحہ میں بھی دین مہر معاف کرنے کے الفاظ تو نہ کہے لیکن اس لغو رسم پر لعنت ضرور بھیجی جو ہمارے اور حبیب کے رشتہ کو آخری وقت تک تجارتی تعلق بنانا چاہتا رہا۔

اب حتمی طور پر میرے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ اگر محض اتفاق سے میری شادی حبیب سے نہ ہوئی ہوتی تو زندگی کی طرف میرا عملی رویہ کیا ہوتا۔ اپنے میکے میں نظریاتی ماحول اور تربیت تو ہمیں یہ ملی تھی کہ عورت اور مرد انسان ہونے کے ناطے ہم پلہ ہیں اور کسی کو کسی پر فوقیت یا برتری حاصل نہیں ہے۔ عورتوں کے زیور کے شوق کا ابا اور اماں دونوں ہی مضحکہ اڑاتے تھے۔ میں نے اپنی اماں کو کبھی زیور پہنے نہیں دیکھا سوائے ہاتھوں میں کانچ کی چوڑیوں کے۔ ابا مجھے پڑھانے کے وقت بہت سی سماجی اور معاشرتی ناہمواریوں (عورت اور مرد کے درمیان) کی نشاندہی بھی کرتے رہتے تھے چنانچہ مجھے بچپن ہی سے زیور پہننے کا شوق تو کیا نفرت سی ہوتی گئی۔ ان کی منطق یہ تھی کہ جیسے جیسے عورتیں اپنے کو زیورات کی بیڑیوں میں جکڑتی گئیں، ان کی ساری صلاحیتوں کا دائرہ سنگھار کی حد تک محدود ہو کر رہتا گیا۔ گھر میں اس درس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ذہنی طور پر میں بر روایاتی بندش اور بندھن سے

آزاد ہوتی چلی گئی۔ لیکن شادی کے پہلے تک کی عملی زندگی میں متضاد صورت حال سے یوں واسطہ پڑا کہ گھریلو زندگی میں وہی سب بندشیں مجھ پر لاگو رہیں جن سے اس زمانہ میں عام متوسط شرفاء کے گھرانوں کی لڑکیوں کا واسطہ پڑتا تھا ویسے میں یہ وضاحت کرتی چلوں کہ عصمت چغتائی کے متوسط گھرانوں کی لڑکیوں کی گھٹن کا مجھے پردہ کی کڑی پابندیوں کے باوجود احساس اور تجربہ نہ ہوا۔ شاید اس کی وجہ یہ رہی ہو کہ میرے اندر کی لڑکی نے عام راستہ سے ہٹ کر اپنی راہ اور منزل کا تعین بہت کم عمری سے ہی کرلیا تھا۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ میں نے ان ساری پابندیوں کے خلاف بغاوت کیوں نہ کردی۔ شاید میری خطرناک فطرت کو سمجھ کر والدین نے فکر وسوچ کی پرواز اور ذہنی بغاوت کی عیاشی پر نہ صرف یہ کہ کوئی پابندی عائد نہ کی بلکہ آزادی فکر کی ہر ممکنہ سہولت بھی فراہم کی لیکن ساتھ ہی حفظ ماتقدم کے طرپر رائج الوقت اخلاقی اور سماجی بیڑیوں کے بندھن میں سختی سے بال و پر جکڑ دیئے۔ مجھے لگتا تھا کہ سارے الہامی اور غیر الہامی مذاہب نے بیک زبان ہوکر عورت کو کم عقل، کم ظرف، گناہ اور فساد کی جڑ تپسیا کو بھنگ کرنے والی اور دوسرے درجے کی مخلوق قرار دینے کا تہیہ کرلیا ہے۔ پتہ نہیں ہنسنے کی بات ہے یا اپنی عقل پر ماتم کا موقع لیکن مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی جھجھک نہیں کہ جب میں نے ابھی حال ہی میں اور بڑھاپے کی عمر میں Dolly Sheep کی کلون کے ذریعہ پیدائش کی خبر سنی تو مجھے بے چاری اماں حوا بہت یاد آئیں یاد آئیں سو آئیں اور اپنی پوری مظلومیت کے ساتھ یاد آئیں مگر مجھے ان سائنس دانوں پر بہت غصہ آیا جنہوں نے اپنی تحقیق کی دھن میں ہماری بیچاری اماں حوا کو بھیڑ بکریوں کے زمرے میں لا کھڑا کیا۔ چلو حوا پہلی انسان تھیں جن کو خالق نے مرد سے کلون کیا تو بھلا سائنس دانوں کو کیا ضرورت پڑی تھی کہ بھیڑ کے بچہ کو حوا کے پہلو میں لا کھڑا کرتے۔

خدائے مجازی یا شریک زندگی

دروپدی نے بھگوان سے اپنے لئے ایسے پتی کی پراتھنا اور اچھا کی تھی جو سارے گنوں پورا ہو۔ یعنی دنیا کے سارے پرشوں سے زیادہ حسین ہو زیادہ بلوان ہو زیادہ بدھی وان ہو سب سے زیادہ پریم کا جذبہ رکھتا ہو۔ مستہ وان ہو وغیرہ وغیرہ..... لیکن بھگوان بھی یہ ساری خصوصیات ایک پرش میں اکٹھا نہ کرسکے ساتھ ہی بھگوان کو دروپدی کا مان بھی رکھنا تھا چنانچہ انہیں پانچوں پانڈو بھائی پتی کے روپ میں ملے جن میں ہر ایک دروپدی کے ایک من چاہے گن سے متعصف تھا پر میں کہاں کی اللہ کی چہیتی تھی جو ہمہ صفت موصوف شریک زندگی کی تمنا کرتی۔ اس زمانے میں ہندوستان میں اکثر فرقہ وارانہ فسادات بقرعید کے موقع پر ہوجاتے تھے جب مسلمانوں کے یہاں گائے کی قربانی ہوتی کہ ان کے مذہب نے گائے کا گوشت ان پر حلال کر رکھا تھا تو وہ ہندوؤں کے ڈر سے اسے اپنے لئے ممنوع کیوں کرلیں اور ہندو مقدس گاؤ ماتا کے تحفظ کے لئے انسانی خون کی کیوں پرواہ کریں۔ سو شادی کے پہلے کبھی کبھی دل میں یہ وسوسہ بھی جنم لیتا تھا کہ کہیں نادار شریک زندگی کو ایک سے زیادہ (چار نہ سہی) شریک زندگی کی خواہش نے اکسایا تب؟ شرع نے تو چار کی

اجازت دے رکھی تھی سو (ناقص العقل) بیوی سے ڈر کر اللہ نے جو حق عطا کیا ہے اس سے دست بردار کیوں ہوں۔

خیر یہ تو میری حد سے بڑھی ہوئی سرپھری سوچ کی گمراہی تھی جو ایسی ایسی گمراہ کن باتیں اتنی کم عمری سے ذہن میں ڈراتی رہتیں لیکن ذرا ابھی عمر کی گمراہ کن سوچ کا توارد دیکھئے۔ برسوں بعد جس سے واسطہ پڑا۔ میں عراق میں ۱۹۸۸ء میں بے بی لون فیسٹیول کے عراقی دعوت پر وہاں پہنچی۔ ان دنوں میں وہاں عرب خواتین کی بین الاقوامی کانفرنس بھی ہو رہی تھی۔ اس میں کسی (غالباً سرپھری عرب خاتون نے) ایک ریزولوشن مردوں کا بیک وقت چار بیویاں رکھنے کے حق کی مذمت میں پیش کیا۔ شدید مخالفت کی بنا پر یہ تجویز پاس نہ ہو سکی ہم نے فیڈریشن آف عراقی ویمن کی وائس صدر سے عورتوں کی طرف سے مخالفت کی وجہ جاننی چاہی تو جواب حاضر تھا کہ مردوں کے اس حق میں تحریف نہیں کی جا سکتی۔ یہ حق انہیں اللہ نے دیا ہے۔

سیندور اور کانچ کی چوڑیاں

مردوں کو چار بیویاں رکھنے کا حق اللہ نے دیا ہے اور عورتوں کو سونے چاندی کے زیور اور سنگھار کرنے کا حق۔ اپنا حال یہ کہ مردوں کو ملے حق سے شاکی اور اپنے حق کے استعمال سے لاپرواہ اپنی فطرت کا تضاد یوں میرے لئے مسئلہ لاینحل بنا رہا کہ سونے کی تو نہیں لیکن کانچ کی چوڑیاں دل سے ہمیشہ بہت نزدیک رہیں۔ اور ان کی کھنک تو لگتا تھا مدھم موسیقی کا سہانا سا رس کانوں میں گھل رہا ہے۔ کبھی کبھی یہ خیال آیا تو ضرور کہ چوڑیاں بھی ہتھکڑیاں ہیں لیکن لاشعور نے اس کی یوں نفی کردی کہ کانچ کی چوڑیاں تو ذرا سا دباؤ پڑنے پر ٹوٹ جاتی ہیں اور یہ مساوات اور نجات کی طرف بڑھتے ہوئے قدم کی رکاوٹ تو بن ہی نہیں سکتیں اور نہ جدوجہد کے راستہ کی چٹان۔

شوہر کو سرتاج کہنا بھلے ہی ایک انقلابی لڑکی کے لئے شرم کی بات ہو یا چلو بھر پانی میں ڈوب مرنے کا مقام لیکن جانے کیوں مجھے بچپن سے ہی عورتوں کی مانگ میں سیندور کی ریکھا بڑی بھلی بلکہ بڑی پرکشش لگتی تھی۔ انڈیا میں مسلم خواتین عام دنوں میں تو سیندور نہیں لگاتی تھیں لیکن شادی کے موقع پر شگون کے طور پر دولہن کی

مانگ سیندور سے ضرور بھری جاتی تھی اور ساتھ ہی دوسری سہاگن عورتوں کی مانگ میں بھی سیندور لگایا جاتا تھا۔ میرا اپنا حال یہ تھا کہ عمر کی اس سرحد تک پہنچنے پر جب شعوری طور پر یہ احساس اور یقین ہو جاتا ہے کہ دوسری لڑکیوں کی طرح اپنی بھی شادی ہونی ہے، یہ تمنا دل میں پال رکھی تھی کہ وقت آنے پر میں مانگ میں سیندور اور ماتھے پر بندیا ضرور لگاؤں گی چاہے اس کرتوت کی پاداش میں تنگ نظر لوگ میرا بائیکاٹ ہی کیوں نہ کر دیں۔ مانگ میں سیندور کی ریکھا شوہر کی حیات کی ریکھا سمجھی جاتی تھی۔ سو عقیدہ کے بغیر پسند ہونے کے کارن میں ہمیشہ سیندور لگاتی تھی۔ شکر ہے کہ سیندور کے شوق کو حبیب نے غیر انقلابی کہہ کر نہیں للکارا۔ پاکستان آنے پر چند ہی روز گزرے تھے کہ لوگوں نے اعتراض کیا کہ سیندور لگانا ہندوؤں کی رسم ہے۔ اسلامی کلچر کے خلاف ہے اور اس کے لگانے سے اسلام کے خطرے میں پڑ جانے کا امکان ہے۔ خیر میری عقل کے مطابق مانگ میں سیندور لگانے سے اسلامی کلچر کو تو کوئی خطرہ لاحق نہ تھا لیکن خود میرے سماجی وجود کو ضرور خطرہ لاحق تھا۔ سو میں نے سیندور کو خیرباد کہہ دیا۔ انہی دنوں ایک بہاری شادی میں جانے کا اتفاق ہوا۔ رسم کے مطابق دولہا کو رونمائی کے وقت دلہن کی مانگ میں سیندور بھرنا تھی۔ چند اسلام پسند خواتین نے شدید اعتراض کیا کہ ہندوانی رسم ہے اور نکاح کے مقدس بندھن کو ہندوؤں کی رسم سے آلودہ کرنا اسلامی شعائر کے خلاف ہے۔ میں نے دل میں سوچا کہ میاں بیوی کا ایک دوسرے کا شریک زندگی ہونے کا تصور اور خواہش بھی تو ہندوانہ ہے۔ کتنی مسلمان خواتین تعدد ازدواج کو اسلامی شعائر میں جگہ دینے کو تیار ہوں گی۔

جیسا کہ میں کہہ چکی ہوں کہ کانچ کی رنگ برنگی چوڑیوں سے بھی مجھے سدا کا پیار تھا کانچ کی چوڑیاں پہننے کے لئے شادی ہونے کی شرط نہ تھی ننھی منی لڑکی کے ہاتھ میں بھی پڑی رہتی تھیں۔ (ویسے بیوہ عورتوں کو کانچ کی چوڑیاں پہننے کی سماجی ریت و رسم کے مطابق ممانعت تھی) اس کے علاوہ سیندور کے برخلاف یہ کانچ کی

چوڑیاں کسی خاص مذہب کی پیرویا دھرم کی پجاری بھی نہ سمجھی جاتی تھیں۔

شادی کے ساتھ ہی مجھے شوہر رائج الوقت سے حبیب بحیثیت رفیق زندگی کے بہت مختلف لگے اور بہت آئیڈیل لگے حالانکہ میں نے خواب میں بھی درویدی کے مانند ایسے شریک حیات کی تمنا نہ کی تھی جو سارے گنوں میں پورا ہو۔ انہوں نے ابتدا ہی سے میرے خیالات وجذبات کی قدر کی۔ آج میں جو کچھ بھی ہوں یا جتنی زندگی کی کنٹھائیوں اور بے اعتنائیوں کا مقابلہ کرنے کی جدوجہد میں نے کی ہے اس میں زیادہ تر ہاتھ حبیب کا ہے۔ حبیب نے بہت سی امیدیں مجھ سے یوں وابستہ کرلیں تھیں کہ وہ مجھے بہت ترقی پسند ترقی پرست اور مڈل کلاس لڑکیوں کی صلاحیت سے بہت بلند جگہ دیتے تھے۔ یہاں صورت حال یہ تھی کہ ذہنی طور پر آسمان میں چھید کرنے والی لڑکی اٹھارہ سال تک پردہ کی جالیوں میں چھید کرنے کی ہمت نہیں کرسکی تھی۔ انتہائی بزدل ، شرمیلی۔ چنانچہ اسی پردہ سے آزادی حاصل ہونے کا جب عملی وقت آیا تو روح فنا..... جب دلہن بن کر میکے سے سسرال رخصت ہوئی تو میکے میں ابٹن مایوں کی رسم تو نہ ہوئی لیکن برقعہ پہن کر رخصت ہوئی۔ سسرال مظفرپور تھا وہی اسٹیمر ٹرین کا چکر۔ ایک ہفتے کے بعد جب پہلی بار سسرال سے میکے جانے لگی تو برقعہ غائب... ہزار سرگرداں ہونے کے باوجود بھی برقعہ نہ ملا۔ لاچار بغیر برقعہ کے ابا کے گھر پہنچی۔ تب پتہ چلا کہ حبیب نے جان بوجھ کر برقعہ غائب کروادیا تھا۔ پٹنہ آئے تو پردہ والی بگھی گاڑی میں کالج جانے پر یا تو اعتراض یا اس کی نامعقولیت سمجھانے کی کوشش اس پر فرمائش کہ کھلے رکشہ پر تنہا بغیر کسی کو ہمراہ لئے ہوئی کالج جاؤ۔

شادی کو دو ماہ ہی ہوئے تھے کہ عید آپڑی۔ حبیب کے والدین مظفرپور میں تھے اور ہم لوگوں کو عید ان کے ساتھ کرنی تھی۔

"کالج سے واپس آکر تم سامان لے کر مہندرو گھاٹ آجانا میں وہیں تم سے ملوں گا۔" یہ کہہ کر حبیب تو آفس روانہ ہوگئے۔ مہندرو گھاٹ تو صرف ایک بار دلہن بن کرلے جائی گئی تھی جب آنکھیں اور زبان دونوں ہی بند تھیں اور سسرال کا

سارا کنبہ آگے پیچھے۔ اب تو یہ بھی نہیں کہہ سکتی تھی کہ مجھے راستہ معلوم نہیں یا مجھے ڈر لگتا ہے۔ آخر بادل ناخواستہ تعلیم یافتہ ذہنی اصولی اور نظریاتی طور پر مردوں کی غلامی سے نجات یافتہ لڑکی کا بھرم شوہر کی نظروں میں رکھنے کے لئے اللہ کا نام لے کر تنہا ہی گھر سے روانہ ہونا پڑا۔ چلتے چلتے اماں نے ٹوک ہی دیا۔ "ہائے اکیلی جاؤ گی دولہا کہاں ہیں؟" چلتے ہوئے جی میں آیا کہ کہہ دوں کہ دولہا ترقی پسند اور باہمت بیوی گڑھنے کی مشین پر بیٹھے ہوئے ہیں مگر اماں کی دل آزاری کے خیال سے مصنوعی مسکراہٹ لبوں پر لا کر بولی تنہا نہیں اماں وہ سڑک کے موڑ پر میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ مندرو گھاٹ پہنچی تو نہ حبیب نہ حبیب کا ہمزاد۔ قلی سے سامان اٹھوا کر ان کی تلاش میں نظریں دوڑانی شروع بھی نہ کی تھیں کہ دیکھا حبیب تیز قدموں سے چلے آ رہے ہیں۔ جب اسٹیمر پر اطمینان سے بیٹھ کر ہم دونوں نے مونگ پھلی کھانے کا شغل شروع کیا تو میں نے خالص خدائے مجازیوں کی نئی نویلی بیویوں والا شکوہ شروع کیا آپ نے مجھے تنہا مندرو گھاٹ..... ارے تمہیں مندرو گھاٹ آنے کے لئے رہبر کی ضرورت ہے تو کمیونسٹ پارٹی کے پرچم کی لاج کون رکھے گا۔

انٹر تو پٹنہ ویمن کالج سے کیا کہ شادی کے فوراً ہی پہلے داخلہ لے لیا تھا کالج میں داخلہ کی بات ہوئی تو حبیب کے اصرار پر مجھے پٹنہ کالج میں داخلہ لینا پڑا۔ شروع میں مخلوط تعلیم کے نام سے ہی روح فنا ہوتی تھی۔ شادی کے پہلے تک میں صرف سوچ کی حد تک ترقی پسند اور مارکسٹ تھی۔ میدان عمل میں لانے کا سہرا حبیب کے سر جاتا ہے اور اس کا سب سے پہلا قدم برقعہ سے باہر لانا اور مخلوط کالج میں داخلہ تھا اور پھر تو پیر آگے ہی بڑھتے چلے گئے۔ آغاز ہوا طلبہ یونین کے جلسوں سے۔

میں جب سسرال میں ہوتی تو ابا (میرے سسر) صبح کی نماز کے لئے مجھے آواز دیتے انہیں کی بنوائی ہوئی مسجد گھر سے متصل تھی۔ سو میں اٹھ بیٹھتی اور اماں اور ابا کے ساتھ مسجد میں نماز کے لئے چلی جاتی۔ تنویر کے عقیقہ کا انتظام بڑی دھوم دھام سے کیا گیا۔ گاؤں کے ایک ایک رعیت کو میرے سسر نے دھوتی ساڑی دی

ضیافت میں سارے دور نزدیک کے عزیز و اقارب مدعو کئے گئے۔ جب مہمانوں کی فہرست بن رہی تھی تو ابا نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا کہ بیٹا میں تو اپنے دسترخوان پر صرف انہیں لوگوں کو مدعو کروں گا جو نمازی ہوں گے۔ "تو میرا کیا ہوگا ابا؟" میں نے بے ساختہ پوچھا بولے، بیٹا صبح کی نماز تو تم ہر روز میرے ساتھ مسجد میں پڑھتی ہو۔ ایک روز اسی طرح جب وہ نماز کے فضائل بیان کر رہے تھے میں نے کہا "ابا آپ کو تو معلوم تھا کہ میں کمیونسٹ ہوں پھر آپ نے حبیب کے لئے میرا انتخاب کیوں کیا؟" بولے اس لئے کہ میں جانتا تھا کہ مولانا علی اصغر صاحب کی بیٹی گمراہ نہیں ہو سکتی۔ صبر و تحمل اور ادراک نفسیات میں کتنی ان کی پہنچ تھی کہ کبھی میرا دل انہیں ناراض یا مایوس کرنے پر آمادہ نہ ہوا۔

تنویر کا عقیقہ ختم ہوا تو ساتھ ہی حبیب کی چھٹیاں بھی ختم ہو گئیں اور وہ واپس پٹنہ چلے گئے۔ دو ہفتے مزید میرا کالج بند تھا سو میں داؤد نگر رک گئی۔ پھر ہماری گرمیوں کی چھٹیاں بھی ختم ہو گئیں۔ داؤد نگر کی زندگی کے روز و شب کا بیان کہیں اور کریں گے ابھی تو ارادہ ایک خوبصورت اور حسین تجربہ کو بیان کرنا ہے جس نے میری کردار سازی میں اہم رول ادا کیا ہے۔ بزرگوں پر اعتماد اور بھروسہ کا ایقان بھی انسان میں بہت سی مثبت تبدیلیاں لاتا ہے ان دنوں داؤد نگر سے مظفر پور گاڑی سے جاتے تھے اور تب مظفر پور سے ٹرین اور اسٹیمر کے ذریعے پٹنہ پہنچتے تھے۔ تنویر میرا بڑا بیٹا چھ ماہ کا گود میں تھا۔ میرے سسر مجھے لے کر مظفر پور آئے۔ دو روز مظفر پور میں (شفیع منزل) میں ٹھہرنے کا پروگرام تھا۔

کچھ یادیں بڑی حسین اور پیاری ہوتی ہیں سو ویسی ہی ایک یاد مظفر پور میں لیچی کھانے سے متعلق ہے۔ جون کا مہینہ مظفر پور کی لیچیاں مشہور عالم ہیں۔ گول گول رس گلے کے برابر اور رس گلے سے بھی زیادہ میٹھے رس بھری اندر چھوٹا سا بیج۔ بارش ہونے سے پہلے لوگ لیچی کھانے کو منع کرتے ہیں کہ اس کی تاثیر بارش کے پہلے گرم ہوتی ہے اور شاید مضر صحت۔ سو ہم نے بھی جیسے ہی لیچی کا نام لیا تو ابا نے

نصیحت کی کہ میں لیچی ہرگز نہ کھاؤں سفر میں طبیعت خراب ہو جائے گی۔ ہم نے سوچا دن کو ابا کی بات مانے لیتے ہیں۔ رات کو انہیں ہمارے کرتوتوں کی خبر کیسے ہو گی۔ گھر میں نوکروں کی فراوانی' انہیں انعام واکرام سے نواز کر خفیہ طور پر ان سے لیچی منگالی۔ ان دنوں ایئرکنڈیشن ایجاد ہوا تھا کہ نہیں لیکن گرمیوں میں رات کو صحن میں چھڑکاؤ کرکے بستر بچھائے جاتے تھے چنانچہ رات کو صحن میں دو چارپائیوں پر بستر لگا کر مچھردانی لگادی گئی اور ایک ہاتھ سے جھلنے کا پنکھا اندر رکھ دیا گیا۔ ہم نے بچے کو سلایا اور آرام سے لیچی جو تکیہ کے غلاف کے اندر اس لئے رکھی ہوئی تھی کہ بستر میں آتے ہوئے اس کی اصلیت کا بھید ابا پر نہ کھل سکے۔ کھانے کی شروعات کی ابھی دو تین لیچی ہی کھائی تھی کہ سخت گرمی سے بے چین ہو کر بچے نے رونا شروع کردیا۔ اب مشکل یہ تھی کہ پنکھا جھل کر اور تھپک کر بچے کو سلاؤں کہ لیچی چھیل کر پانی سے بھرے منہ میں ڈالوں۔ ہم نے سوچا کہ رونا تو بچے کی فطرت ہے اور یہ بھی سن رکھا تھا کہ رونے سے بچے کے پھیپھڑے مضبوط ہوتے ہیں اور لیچی اگر نہ کھائی تو پھر صبح تک نصیب نہیں ہوگی۔ ویسے بھی چوری چوری لیچی کھانے کا دلچسپ مشغلہ اور روتے بچے کو بہلانے کا غیردلچسپ مشغلہ میرے مشفق سسرجی نے سمجھا کہ ان کی پیاری سی کالج میں پڑھنے والی بہو نیند میں مست ہے اس لئے بچے کی طرف دھیان نہیں دے رہی ہے اپنے بستر سے ہی پکارا۔ بیٹا تمہیں نیند آرہی ہے بچہ مجھے دے دو میں اسے پنکھا جھل کر سلادوں گا چنانچہ وہ بچہ لے کر اپنے بستر پر پنکھا جھل کر اسے سلایا کئے اور میں ناخلف بہو رس بھری لیچی ختم کرکے آرام سے سوگئی۔ ایسے بزرگوں کی عنایت اور محبت جب بھی یاد آتی ہے اور اکثر یاد آتی ہے تو دل میں بڑی کسک سی محسوس ہوتی ہے۔ بزرگوں کی چاہتوں کو یوں دل کبھی ترسے گا اس کا علم ہوتا تو شاید.... مگر شاید کے امکانات تک کون پہنچ پایا ہے۔

بظاہر اس غیر اہم سے واقعہ کی یاد نے میرے ذہن کو اچانک جھنجھوڑ دیا ہے۔ خیالات کی رو کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ بزرگوں کی شفقت' بے غرض قربانی ان کی

طرف سے تحفظ کے چھتر چھایا ملنے کا یقین اور طمانیت کا احساس دوسری طرف چھوٹوں کی فرمانبرداری سعادت مندی فرض شناسی اور شفیق بزرگوں کو ہمیشہ خوش رکھنے کا عزم..... مگر یہ تو میں ماضی کو یاد کرتے کرتے ماضی کی دنیا میں پہنچ گئی۔ یہ تو اس کلچر کی یاد ہے جو دم توڑ چکا ہے۔ بیسویں صدی کو خیرباد کہتے کہتے ہم گلوبل کلچر کی زد میں نہیں بلکہ چکر میں پھنس چکے ہیں۔ ذرائع آمد و رفت میں انقلابی تیزی' ریڈیو' ٹیلی ویژن' کمپیوٹر کی عنایات سے ہر نئی ایجاد' نیا انداز فکر یا نیا واقعہ کرہ ارض کے کونے کونے میں بیک وقت رسائی حاصل کرلیتا ہے۔ جمہوریت حقوق انسانی فرد کے حقوق' دوش بدوش نسل پرستی' مذہبی عدم رواداری' دہشت گردی' کے عناصر ملتے ہیں۔ انسانی معاشرہ اپنی خصوصی اقدار کے باوجود ہمیشہ ایک دوسرے میں ضم بھی ہوتا رہا ہے اور نئے اثرات قبول کرکے تبدیل بھی ہوتا رہا ہے لیکن یہ تبدیلی شعوری اور انسانی ضرورت کے تقاضوں کے ماتحت ہوتی ہے۔ آج گلوبل کلچر کو اپنانے نہیں اپنانے کا انحصار ہماری ضرورت یا پسند ناپسند پر نہیں رہ گیا ہے بلکہ یہ ہماری مجبوری بن گئی ہے۔ آج نئی نسل کو ہم فرض شناسی کا سبق سکھائیں تو یہ اس کے انفرادی حقوق کی نفی ہوگی۔

نیا عالمی کلچر لمحاتی ہے اس میں نہ تو تسلسل ہے نہ مقصدیت اور توازن اور نہ ٹھہراؤ' پائیداری اور تسلسل نظریاتی اقدار کی غیر موجودگی کا نمائندہ آج کے لمحاتی گلوبل کلچر کو نئے نئے تجربات اور انکشافات کی آمیزش پر مبنی' اضطراری' انسانی طرز عمل کہہ سکتے ہیں جو موجودہ تمدن کی ناپسندیدہ لیکن لازمی دین ہے۔

اتنا ہی نہیں سارے کرہ ارض سے ہزاروں نوع کی تہذیبیں بلا اپنا وارث پیدا کئے ہوئے ناپید اور فنا کی جارہی ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ قدیم تہذیبوں کی ساری افادیت آج بھی ختم نہیں ہوئی ہے۔ انہیں یکسر بے نام و نشان کردینا انسانی اقدار اور قدیم معلوماتی مخزن کا عظیم زیاں ہے۔ قدیم قبائلی کلچر میں انسانوں کو بہت سارے ایسے رازہائے فطرت کا ادراک تھا جو آج بھی سائنس کی کشود سے پرے

ہیں اور جن کے سراغ پانے کے لئے جدید سائنس سرگرداں ہے۔

چنانچہ اگر نسل کشی انسانیت کے خلاف جرم ہے تو "تہذیب کشی" بھی جرم سے کم نہیں۔ میں قدامت پرستی کی حمایت نہیں کرتی ہوں اور نہ میرا مقصد آسمان کی سطح میں چھید کرنے والی حرکات کی مذمت کرنا ہے۔ اس حقیقت سے کون انکار کرسکتا ہے کہ اسی لمحاتی تہذیب نے انسان کو طویل العمری بخشی ہے بھلے ہی یہ زندگی کے مزید سال اسے زندگی سے منہ موڑ کر دائمی نیند کے انتظار، تنہا عزیزو اقارب اپنے پیاروں بچوں سے علیحدہ انتہائی کرب اور مایوسی میں گزارنی پڑے کہ وہ لوگ اپنے اپنے انفرادی اور ذاتی عیش و آرام اور لذت نفس حاصل کرنے کی جدوجہد میں مصروف ہیں جو بحیثیت فرد کے ان کا حق ہے۔

مردہ تہذیب کا ماتم بے سود اور چیختی بھاگتی ہوئی تہذیب پر تنقید وقت کا زیاں بس یہی تمنا کرسکتے ہیں کہ بھاگتے ہوئے قدم کے ساتھ انسانیت محبت، امن آشتی اور احساس ذمہ داری کا دامن نہ چھوٹنے پائے۔

حبیب

میری شادی ہوئی تو مجھے حبیب کے بارے میں کچھ پتہ نہ تھا سوائے اس کے کہ وہ مولانا شفیع داؤدی صاحب کے لائق و ہونہار فرزند ہیں۔ ان کے سیاسی و نظریاتی خیالات کا کچھ اندازہ نہ تھا۔ ان کے گھر والے سماجی طور پر خاصے ترقی پسند تھے۔ لیکن بائیں بازو کے نظریات سے متاثر ہونا تو درکنار اس کے سخت مخالف تھے۔ ہم نے بھی فرض کرلیا تھا کہ حبیب سے میرا ذہنی ملاپ شاید کبھی نہ ہوسکے۔ اس تفاوت کے کارن یہ ناؤ کیسے پار لگے گی اس پر کبھی سنجیدگی سے سوچنے کی ہمت بھی نہ پڑتی تھی۔ لیکن یہ حیرت ضرور ہوتی تھی کہ کالج یونیورسٹی کے کامریڈ لڑکے لڑکیوں کے ساتھ ملنے جلنے اور ان لوگوں کے ساتھ باہر جلسے جلسوں میں جانے پر حبیب اعتراض تو کیا کرتے میری ہمت افزائی ہی کرتے تھے۔ شاید وہ یہ سب صرف طلبا کی سرگرمیاں سمجھ کر نظرانداز کرتے ہیں۔ میں سوچ کر ان کی غلط فہمی اور معصومیت پر ترس کھایا کرتی تھی۔ جب انہیں معلوم ہوگا کہ میں نے باقاعدہ کمیونسٹ پارٹی کی رکنیت لی ہوئی ہے تو ان کا ردعمل کیا ہوگا۔ میری دانست میں یہ راز ان پر تب افشاں ہوا جب میں بیڑی ورکرز اسٹرائیک کے دوران بہار شریف میں جلوس کی رہنمائی کرتے ہوئے

گرفتار ہوئی۔ گرفتار ہوئی تو سمجھا کہ اب حبیب میری صورت دیکھنے سے بھی انکار
کردیں گے مگر وہ تو ضمانت لینے جیل آپہنچے۔ میرے قیاس نے پرواز کی تو بس یہیں
تک کہ شاید یہ بھی ذہنی ارتقاء سے گزرتے ہوئے کمیونسٹ پارٹی کے ہمدردوں کے
درجے تک پہنچ گئے ہیں ویسے یہ بتاتی چلوں کہ جب شادی ہوئی تھی تو ہمارے بھیا علی
اطہر صاحب نے حبیب کو کہا تھا کہ زہرا بہت باغیانہ مزاج کی لڑکی ہے' اب اسے
حدود پھلانگنے سے روکنا تمہاری ذمہ داری ہے۔ (حبیب اور بھیا کی آپس میں بہت
بے تکلفانہ دوستی تھی۔)

کتاب کے حصہ اول میں' میں نے اپنی گرفتاری کی تفصیل بیان کی ہے بانکی پور
جیل میں وہ مجھ سے ملے بھی اور ضمانت پر مجھے چھڑایا بھی۔ یہ بھی بتایا ہے کہ جیل
سے چھوٹ کر گھر جانے کی امید سے خوشی تو کیا ہوتی یہ فکر ستانے لگی کہ کہیں حبیب
مجھے پابند سلاسل کرنے کی کوشش نہ کریں۔ مگر میں نے پوری کوشش کی کہ چہرے
سے کسی تاثر کا اظہار نہ ہونے دوں۔ میں اصل میں جیل میں حبیب کو دیکھ کر ہکابکا
رہ گئی تھی۔ سرکاری ذمہ دار عہدہ پر فائز ہوتے ہوئے وہ مجھ سے ملنے اور میری
ضمانت کی کوشش کریں گے مجھے خواب میں بھی کبھی امید نہ تھی۔ جیل میں ہم پر کیا
گزری' حبیب تو تھوڑی دیر جیل میں مجھ سے مل کر چلے گئے۔ نہ انہوں نے مجھ سے
کچھ پوچھا اور نہ میں نے کچھ بتایا کہ جیل میں کیا گزر رہی ہے یا کیا بیت رہی ہے۔
بچے البتہ رخصت ہونے کے وقت خوب مچلے خوب روئے۔ آنکھیں جب ریت سے
بھرنے لگیں تو جی سہم کر رہ گیا کہ کہیں پانی کا زور حصول اور تیاگ کے بندھن کو بہا
نہ لے جائے۔ کہیں حبیب (جو پارٹی کارڈ ہولڈر نہ ہو کر بھی استقامت کا مجسمہ ہیں
میری کمزوری سے واقف نہ ہوجائیں۔ کہیں بچے بھی مجھ سے لپٹ کر مجھے کمزور نہ
کردیں۔ خیر یہ سب کچھ نہ ہوا حبیب نے بچوں کو بھی بہلایا اور مسکراتے ہوئے اس
طرح مجھ سے رخصت ہوئے گویا میں نے ان کا وقار انسانیت کے جگ میں بہت بلند
کردیا ہے۔ میرا جیل میں ہونا کوئی انوکھی اور پریشانی کی بات نہیں ہے۔ زہرا تمہیں

تو دار کے لئے تیار رہنا ہے یہ جیل کیا چیز ہے۔

بہار شریف چھوٹی سی جگہ اور چھوٹا سا جیل خانہ جہاں شاید پہلی بار اونچے طبقے سے تعلق رکھنے والی مسلمان کمیونسٹ لڑکی کو بند کیا گیا ہو۔ ان دنوں سیاسی قیدیوں کو خصوصی وارڈ میں رکھا جاتا تھا لیکن بہار شریف میں جیل خانہ میں سیاسی جرائم کی مرتکب خواتین کے لئے کوئی اسپیشل وارڈ تھا ہی نہیں۔ چنانچہ پہلے روز تو مجھے ایک چھوٹے سے سیل میں بند کیا گیا۔ ہمارے ساتھ کئی اور کامریڈ بھی گرفتار ہوئے تھے۔ انہیں سیاسی قیدیوں کے وارڈ میں رکھا گیا اور وہ ایک دوسرے سے آزادی سے مل سکتے تھے مجھے تنہائی میں رکھا گیا تھا۔ غضب کی سردی زمین پر سونے کے لئے اور اوڑھنے کے لئے دو انتہائی منحوص اور غلیظ کمبل، کونے میں چکٹ سی ٹن کی بالٹی میں پانی اور شاید ٹن کا گلاس پانی پینے کے لئے۔ واش روم اور لیٹرین اسی کوٹھری کے کونے میں مگر واہ رے جذبہ دل ذرا پشیمانی نہیں پچھتاوا نہیں، گھبراہٹ نہیں۔ ہاں کوٹھری کے ماحول سے کراہت ضرور ہو رہی تھی۔ ویسے مایوسی ہوتی بھی کیوں ہم انقلابیوں نے کب یہ امید کی تھی کہ انگریز ملک چھوڑ جائیں گے تو ملک میں مزدوروں کسانوں کا راج قائم ہو جائے گا۔ محنت کش طبقہ کی حکومت ہوگی اور محنت کشوں کا استحصال قصہ ماضی بن کر رہ جائے گا وغیرہ وغیرہ۔ ہاں انگریزوں سے چھٹکارا پانے پر جشن آزادی خوب زور و شور اور جذبہ کی گہرائی سے منایا تھا۔

بہرحال جیل کی کال کوٹھری میں بند ہونے کے بعد کمبلوں کو تو خیر کون کا فرہاتھ لگاتا۔ ساری رات ٹہل ٹہل کر گزار دی۔ کمبلوں کو تو چھونے سے بھی گھن آرہی تھی جانے کس کس نے اسے اوڑھا ہے اور کون کون سی بیماریوں کے مجرموں کے جراثیم اس میں پل رہے ہیں۔ اس وقت یہ بات بالکل یاد نہ تھی کہ یہ ساری نزاکت اور نفاست بوڑواتی کلچر کا رکن ہونے کا نتیجہ ہے یا مڈل کلاس کی بیمار ذہنیت کی عکاسی کرتا ہے اور مڈل کلاس ہمارے سائنٹفک مارکسزم کی تعلیمات کے مطابق (جس کی میں شیدا تھی) انتہائی ناقابل اعتبار طبقہ ہے اور جس پر انقلاب لانے کے

لئے ہرگز اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔ بہر حال صبح ہوئی متعفن کوٹھری کا دروازہ کھلا۔ دیکھا تو ایک عورت اچھی صاف ستھری تھال میں ناشتہ کا سامان لے کر آئی بڑی مہربان اس کی شخصیت لگ رہی تھی۔ بے چاری نے بڑے پیار سے مجھے مخاطب کرکے تھال میرے آگے بڑھادی۔ ہم نے تھالی اٹھا کر (بظاہر اس کے سر کا نشانہ لے کر لیکن اصل میں اس کا سر بچا کر دیوار پر دے ماری اور اس سے مطالبہ کہا کہ مجھے میرے ساتھیوں سے ملاؤ ورنہ بھوک ہڑتال کا حربہ تو ہے ہی ویسے چونکہ گرفتاری اور جیل میں احتجاج کرنے کا کوئی تجربہ نہ تھا اور گرفتار ہونے والوں میں 'میں واحد لڑکی تھی اس لئے سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا رویہ اپنانے سے میری گرفتاری بڑی خبر بن سکتی ہے۔ ہمارے ساتھ کے دوسرے کامریڈ جو گرفتار ہوئے تھے وہ سب مردانہ وارڈ میں ایک ساتھ تھے لیکن ان سے تبادلہ خیال کی کوئی صورت نظر نہیں آرہی تھی۔ خیر یہ احتجاج موثر ثابت ہوا اور تقریباً دس بجے مجھے زنانہ وارڈ میں لے گئے صاف ستھرا کمرہ' شفاف بستر' تکیہ اور کمبل معلوم ہوا کہ چونکہ میں سیاسی ملزم یا مجرم ہوں اس لئے مجھے اے کلاس کے قیدی کا درجہ ملا ہے۔ دو قیدی عورتیں میرا کھانا پکانے اور دوسرے ذاتی کاموں کے لئے وقف تھیں۔ کھانے کا راشن' گھی' باسمتی' سبزی' ڈبل روٹی' انڈا وغیرہ مہیا کیا جاتا تھا کہ تاکہ میں اپنی پسند کا کھانا پکواسکوں۔ ان قیدی عورتوں کی داستان بڑی دردانگیز ہوتی تھی سب کی سب ویسے تو اخلاقی یا فوجداری جرائم کی مرتکب تھیں یا غلط کسی دشمنی کی بنا پر انہیں پھنسایا گیا تھا لیکن تب مجھے ایسا محسوس ہوا کہ یہ بے چاری عورتیں تو معصوم ہیں جرم تو ہمارے استحصالی معاشرے نے کیا ہے۔

ڈاکٹر ریاست ان دنوں پٹنہ میں سول سرجن تھے۔ میرا میڈیکل چیک اپ کرنے بانکی پور جیل میں آئے میرے سسر شفیع داؤدی صاحب سے ان کے مراسم تھے۔ میں نے ان سے حتی الامکان عدم تعاون بلکہ ناشائستگی کا برتاؤ کیا۔ بے چارے شریف آدمی تھے بعد میں مجھے اپنے نازیبا رویہ پر افسوس بھی ہوا۔ لیکن اس زمانے

میں کمیونسٹ ہونے کی یہی شان تھی۔

مجھے ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کے تحت گرفتار کیا گیا تھا۔ حبیب نے میری ضمانت کرائی اور بغیر اس بات کی پرواہ کیئے ہوئے کہ ان کا یا ان کی نوکری کا کیا بنے گا مجھے روپوش ہونے میں مدد دی اور میں ان کی ضمانت کے طفیل جیل سے باہر آتے ہی انڈر گراؤنڈ ہوگئی۔ اس کا یعنی دوران روپوشی میرے رہنے کا انتظام بھی وہی کرتے رہتے تھے۔ انڈر گراؤنڈ میں مجھ پر کیا گزرتی رہی اور کیسے کیسے دلچسپ لطائف ہوئے ان کی تفصیل میں نے اس کتاب کے حصہ اول میں دی ہے۔ ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ ختم ہوا کمیونسٹ پارٹی پر سے غیر قانونی ہونے کی پابندی بھی ختم ہوئی تب میں بھی زیر زمین سے باہر آگئی اور اب کھلے بندوں پارٹی کے جھنڈے تلے کام کرنے میں کوئی رکاوٹ نہ رہی۔ میرے تینوں لڑکے تنویر' جاوید ناہید' میری زمانہ طالب علمی میں ہی پیدا ہوئے اور اب میرا کارکردگی کا محاذ پھر سے طالب [illegible] ڈیکوں تک ہی محدود کردیا گیا۔ بیڑی ورکرز یونین کے جھنڈے تلے غیر قانونی سرگرمی وہ پہلی اور آخری تھی۔ ہمارے بی۔اے کے نتیجہ آنے کے دو ماہ بعد جاوید کی پیدائش ہوئی تھی۔ ایم اے کا امتحان ہونے والا تھا کہ ناہید صاحب تشریف لائے تین چھوٹے بچوں کے ساتھ طلباء کی سیاست میں سرگرمی اور پورے جوش و خروش سے حصہ لینا۔ اب میں سوچتی ہوں تو سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ سیاسی اور گھریلو زندگی کا تواز اگر حبیب کا بھرپور تعاون حاصل نہ ہوتا تو برقرار رکھنا ناممکن تھا۔ معاشیات میں ایم۔اے کرنے کے پانچ سال بعد پٹنہ کالج سے ہی علم سیاسیات میں ایم۔اے کیا اور ساتھ ہی ساتھ اپنے سب سے چھوٹے بیٹے ندیم کو بھی خوش آمدید کہا۔

ادھر ہم نے سیاسیات میں ایم۔اے کیا ادھر حبیب سینٹرل گورنمنٹ کے خصوصی امتحان کے ذریعے ریلوے کی مرکزی سروس کے لئے منتخب ہوگئے۔ کچھ عرصہ ٹریننگ کے بعد پہلی پوسٹنگ کلکتہ میں ہوئی اور ہم سبھوں کو پٹنہ خیرباد کہہ کر کلکتہ سدھارنا پڑا۔ کلکتہ جانے کے پہلے ہی پارٹی دو دھڑوں میں بٹ چکی تھی۔ ماسکو نواز

اور چین نواز' وہاں کے مقامی کچھ کامریڈ اشخاص سے بس جان پہچان تو ہوئی لیکن سرگرم ہونے کا موقع نہ تھا ویسے کلکتہ میں کچھ برے اچھے اور پر خلوص افراد سے ملاقات ہوئی اور راہ و رسم اس حد تک بڑھی کہ جذباتی طور پر وہ ہمارے خاندان ہی کے افراد خانہ بنے۔ سرفہرست نام آتا ہے خدیجہ احمد اور شفاعت احمد کا ان دونوں میاں بیوی سے کلکتہ میں صرف دو تین سال کا ساتھ رہا لیکن اتفاق ایسا کہ ہم دونوں ہی نے ایک ساتھ پاکستان آنے کا فیصلہ کیا اور اب تو یہ دوستی اس حد تک بڑھ گئی کہ کوئی اہم فیصلہ ہمارا شفاعت احمد کی مشاورت کے بغیر نہیں ہوتا اور خدیجہ تو ہماری اکلوتی بہن ہیں اگرچہ منہ بولی۔ آج کل وہ امریکہ میں اپنے بیٹے کے پاس ہیں اور فون سے زیادہ ای۔ میل سے ان سے رابطہ رہتا ہے۔ دوسرا نام نسیم احمد اور ان کی بیگم ثریا کا آتا ہے۔ انڈیا چھوڑنے کے بعد ان سے ملاقات تو نہ ہوئی لیکن جذباتی وابستگی اپنی جگہ ہے اور گنانے کو تو بے شمار نام ہیں۔

پارٹی کے قانونی ہونے کے فوراً" بعد ہی اور حبیب کی کلکتہ پوسٹنگ ہونے سے پہلے کی بات ہے کہ کلکتہ میں یوتھ کانفرنس منعقد ہوئی۔ ہمیں پٹنہ گرلس اسٹوڈنٹ کے ڈیلی گیٹ کے سربراہ کی حیثیت ملی۔ ہمارے ساتھ کئی اور لڑکیاں تھیں جو بھی مختلف تعلیمی اداروں میں زیرِ تعلیم تھیں۔ میں واحد مسلمان لڑکی لیکن ہم سب کامریڈ تھے اور باہم شیر و شکر سبھوں کی سوچ اور سوچ کا دھارا ایک اور سب سے اہم بات یہ کہ دل کی لگن ایک۔ جس نظریہ کی صداقت پر ایمان لائے تھے اس کے لئے ہم سبھوں کے دلوں میں مر مٹنے کا جذبہ تھا۔ لائحہ عمل اور طریقہ کار جو رہنما کامریڈ سمجھا دیتے وہی سچا راستہ معلوم ہوتا تھا۔ نہ ذاتی نفع نقصان کی پرواہ تھی نہ نام اور شہرت حاصل کرنے کی تمنا۔ آج ہم سب بچھڑ گئے نظریاتی کامریڈ شپ کیسی کوئی کسی کا پرسان حال ہی نہیں۔

رات نو بجے پٹنہ سے ٹرین چلی تو مختلف جنکشنوں اور اسٹیشنوں پر رکتی رکاتی ہوئی صبح کلکتہ کے ہوڑہ جنکشن پر پہنچی۔ پارٹی کے پلیٹ فارم سے زندگی میں پہلی بار

کسی کانفرنس میں نمائندگی کرنے کا موقع ملا تھا۔ تنویر، جاوید، ناہید، تینوں بچوں کو چھوڑتے ہوئے دل بہت مچلا اور دکھا مگر دل کا کیا اس کا تو کام ہی ہے نادانی کرنا اور گمراہ کرنا۔ آخر محنت کش مزدوروں اور استحصال شدہ طبقوں کے بچوں کی ان گنت مائیں کیسے اپنے بچوں کو مجبوری اور مفلسی کے کارن در در کی ٹھوکریں کھانے کے لئے چھوڑنے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔ میرا تعلق اصل میں برژوا طبقہ سے ہے نا۔ یہ تو ہوتا ہی ہے ناقابل اعتماد اور بزدل طبقہ۔ یہ اپنے طبقہ کے مفاد سے الگ ہوکر قربانی کرنا اور انقلاب کی رہنمائی کرنا کیا جانے اور میں تو بچوں کو اماں کے پاس چھوڑ کر جارہی ہوں جو مجھ سے کہیں زیادہ بچوں کی فکر کرتی ہیں اور پھر بچوں کے پاپا بھی تو ہیں اور پھر میں نے تو "گورکی کی ماں" کتاب سے ماں کے کردار کو دل ہی دل میں دہرانا شروع کردیا جو مجھے خوب اچھی طرح یاد تھا اور یوں امڈتے آنسو رکے۔

کلکتہ جنکشن پر کانفرنس کے کچھ رضاکار ہمیں لے جانے کے لئے آئے تھے۔ ایک بنگالی گھرانے میں ہم ٹھہرائے گئے جہاں پہلے سے مدراس سے آئی ڈیلی گیٹ خواتین کامریڈ ٹھہری تھیں۔ کھانے میں ہمیں گرم گرم بھات اور جھال (شوربہ) والی مچھلی ملی۔ شام کو ڈیلی گیٹ کی میٹنگ تھی۔ دوسرے روز شہر میں زبردست امن مارچ اور پھر اس کے اگلے روز شام کو کھلا اجلاس اور یوں ہم نے انسانوں کا جم غفیر دیکھنے کا تجربہ حاصل کیا اور یہ تاثر لے کر لوٹے کہ "نشستم و گفتم و برخاستم" مگر پٹنہ لوٹ کر اس تاثر کی رپورٹ ہم نے کامریڈ رہنماؤں کو نہیں دی کہ Revesionist ہونے کا لیبل کہیں چسپاں نہ ہو جائے۔

"ارے آپ کو پارٹی ممبر شپ کب ملی؟" یکایک حبیب کی وارڈروب سے ان کی پارٹی ممبر شپ کا دستاویزی ثبوت ہاتھ آگیا تو میں دنگ رہ گئی۔ اتنا ہنس مکھ دوستوں کا دوست بظاہر زندگی کو بہت ہلکا پھلکا لینے والا انسان اور پارٹی ممبر اور مجھے خبر بھی نہ ہوئی جب کہ آج تک حبیب نے مجھ سے کوئی بات راز نہ رکھی تھی بلکہ میں تو انہیں پیٹ کا بہت ہلکا سمجھتی تھی کلکتہ پہنچنے کے دوسرے ہی روز کی بات ہے "اور

تم کو پارٹی کارڈ کب ملا تھا؟" حبیب نے الٹا سوال داغ دیا تو لو انہیں تو شاید میری ساری پوشیدہ سرگرمیوں کا علم ہے ہو نہ ہو منجل مکرجی نے انہیں بتادیا ہوگا حالانکہ منجل نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ میری ممبرشپ بالکل خفیہ رہے گی۔ یہ مرد ذات کیمونسٹ ہوجاتیں مگر Male Chauvinism سے چھٹکارا نہیں بھلا حبیب کوئی میرے سرپرست ہیں جو ان کی ممبرشپ مجھ سے خفیہ رکھی اور میرے بارے میں انہیں ساری خفیہ باتیں بتادیں تب تو حبیب کو میری ساری سرگرمیوں کا علم بھی ہوگا۔ خیر خدا کا شکر ہے غیر قانونی سرگرمیوں میں ملوث رہی ہوں غیر اخلاقی حرکت کوئی سرزد نہیں ہوئی جانے کیوں میں نے سہم کر دل ہی دل میں سوچا سو فورا" ہی اندر کی چھپی ہوئی فیمنسٹ عورت نے سرزنش کی۔ "کیا ہے اگر غیر اخلاقی حرکت بھی کی ہوتی یہ غیر اخلاقی اور اخلاقی معیار تو برژوا کلچر کی دین ہیں۔ جہاں فرشتوں کے پر میں لرزاں میں اس بلندی پر جارہی ہوں" (میں تو طبقاتی تقسیم سے پرے پہنچنے کے لئے سرگرداں ہوں۔ اس غیر طبقاتی حد پر جو برژوا عفونت زدہ اور استحصالی کلچر سے بہت بلند ہے کہ میں مارکسٹ ہوں لیکن پھروہی گھسی پٹی ذہنیت کہ مجھے کیا ڈر میں نے کون سی غیر اخلاقی حرکت کی ہے۔ جو برژوا اور غیر طبقاتی کلچر کے چکر میں پڑوں۔ پارٹی ممبرشپ کے راز کے طشت ازبام ہونے کی بات پارٹی کے قانونی ہونے کے بہت بعد کی ہے تب حبیب کی پوسٹنگ کلکتہ ہوگئی تھی۔ پارٹی دو دھڑوں میں بٹ چکی تھی یعنی چین نواز اور ماسکو نواز، حبیب نے اپنا تنظیمی رابطہ کلکتہ کی کیمونسٹ پارٹی سے رکھا ہوا تھا۔ گو کہ یہ رابطہ بڑا سرسری تھا۔

کلکتہ میں، ہماری ملاقات پرویز بھائی سے ہوئی اور ہم خیال اور ہم مشرب ہونے کی وجہ سے بہت جلد ہم لوگ آپس میں گھل مل گئے۔ اکثر شامیں ان کے ساتھ گزرتی تھیں جس میں وہ اپنے اشعار سنایا کرتے تھے۔ حبیب کے انتقال کے بعد پرویز بھائی کا تعزیتی خط میرے پاس آیا تھا ابھی میں ذہنی طور پر حبیب کے صدمے سے جانبر ہوکر جوابی خط لکھنے کے قابل بھی نہ ہوپائی تھی کہ خبر آئی کہ ان کا بھی انتقال ہوگیا ہے

پھر فضیلت بھابی اور ان کی بچی سے کبھی رابطہ نہ ہوسکا۔ آج تک جی چاہتا ہے کہ کہیں ان سے سر راہ ٹکراؤ ہوجائے اور ہم دونوں ایک دوسرے کو پہچان کر اپنی اپنی کہانی سنائیں اور سنیں مگر جی کی ہر اچھا کہاں پوری ہوتی ہے۔

"کوئی شیشہ نہیں میرا سر ہی تو تھا"

"یہ دستور زباں بندی ہے کیسا تیری محفل میں"

جیسا کہ حصہ اول میں بیان کیا ہے کہ ۱۹۶۵ء میں ترک وطن کر کے پاکستان آگئے۔ پاکستان ہجرت کرتے ہی جس چیز نے سب سے زیادہ متوجہ کیا وہ یہاں کی لاتعداد مسجدیں اور لاؤڈ اسپیکر پر پانچوں وقت کی اذان کی آوازیں۔ بڑی امید افزا بات لگی کہ چلو ہندوستانی مسلمانوں کے جذبۂ ایمانی کا فائدہ اٹھا کر پاکستان بنالیا تو کم از کم انہیں اچھا مسلمان بننے کا پورا پورا موقع تو میسر آگیا کہ پانچوں وقت کی آذان کی آواز سن کر اور مسجدوں میں نماز ادا کرنے کے بعد ان کے پاس کہاں وقت بچے گا کہ چوری، رشوت خوری، اقرباء پروری، اسمگلنگ اور دوسری ان گنت برائیوں میں ملوث ہوں کہ پانچ بار اللہ کے حضور سر جھکانے کے بعد یقیناً باقی وقت کسب حلال کی روٹی کی فکر ہوگی۔ لیکن یہ حقیقت ظاہر ہونے میں دیر نہ لگی کہ "من صرف اس ہندوستانی مہاجر (اپنی ذات مراد ہے) کا ہی پاپی نہیں ہے بلکہ پاکستان کے بے چارے معصوم بھولے بھالے عوام کو چھوڑ کر یہاں کے صاحب اقتدار دولت مند اور حکمران طبقہ کا ہر فرد ایک سے ایک بڑھ کر پاپ کا گٹھر سمیٹے ہوئے فرحان و خندان

لٹیروں کے قافلہ کا سالار بننے کی کوشش میں رواں دواں ہے۔ مجھے آئے ہوئے چند ہی روز ہوئے تھے کہ مغرب کی اذان ہوئی۔ بیگمات نے دوپٹہ تہہ کر کے سر پر رکھ لیا۔ اذان ختم ہوتے ہی لوگ وضو اور نماز کے لئے دوڑے۔ ارے وضو کیجئے بھئی اذان ہو گئی نماز نہیں پڑھنا ہے کیا؟ کسی نے مجھے خواب غفلت سے جگانے کی کوشش کی اگرچہ اب تک یہاں کے مذہبی اور اخلاقی معیار کا خاصا اندازہ ہو چکا تھا اور ہم نے ایسے مواقع پر اپنی زبان پر قابو رکھنے کا گر بھی ایک حد تک سیکھ لیا تھا مگر خطا کرنے کی بشری کمزوری پر اب تک پوری طرح حاوی نہ ہو پائے تھے چنانچہ بے ساختہ اور بلا ارادہ ہی منہ سے نکل گیا "دامن نچوڑ دوں تو فرشتے وضو کریں" اور چند خشمگیں نگاہوں سے مجھے نظریں چرانی پڑیں۔

جب ہم پاکستان آئے تو ایوب خان کا مارشل لاء لاگو تھا کسی بھی قسم کے اظہار خیال سے ڈر لگتا تھا اور زباں تھی کہ قابو میں ہی نہ آتی تھی۔ سیاست اور اخلاقیات اور مذہب کے موضوع پر ہندوستان میں آزادی کے ساتھ اظہار خیال کرتے رہتے تھے کوئی ہمدم نہ غم گسار حبیب نے اپنے غلط فیصلے کی تلافی جان دے کر کر دی نہ مصیبتیں جھیلیں نہ کرب کے پچھتاوے سے گزرے۔ یہ سارے فرائض تو شریک زندگی ہونے کی حیثیت سے مجھے ادا کرنے پڑے۔ ہجرت کا فیصلہ صرف حبیب کا تھا اور کیوں یہ فیصلہ انہوں نے کیا۔ یہ آج تک میرے لئے معمہ ہی رہا۔ سو اکثر سوچتی ہوں کہ کیا واقعی میں بقول پرویز بھائی کے "کوئی شیشہ نہیں میرا سر ہی تو تھا جسے حبیب نے داؤ پر لگا دیا۔"

پاکستان کا امیگریشن ویزہ مجھے اور میرے پاسپورٹ پر دو چھوٹے بچوں کو ملا تھا۔ حبیب وزٹ ویزہ پر آئے چونکہ وہ ریلوے میں تو سینئر عہدے پر فائز تھے لیکن ڈگری کے لحاظ سے صرف بی۔اے تھے اس لئے انہیں اپنے امیگریشن کے کاغذات پاکستان سے دلی لینا تھے۔ ہم پاکستان میں نئے نئے وارد تھے سیاسی تعلقات کی سنگینی کا اندازہ نہ تھا۔ یکم ستمبر کو حبیب اپنے کاغذات لینے کے لئے دلی چلے گئے یہ حبیب کے

لئے بڑا نازک اور تکلیف دہ دور تھا جب ہندوستان میں اپنوں نے بھی انہیں قبول کرنے سے انکار کردیا اور ان پر پاکستان کا ایجنٹ ہونے کا شک کیا تو موت کے فرشتہ کو وہ اپنے ساتھ لیتے آئے۔ حبیب نے آخرت کا سفر یکم فروری ۱۹۶۷ء میں کیا۔ پاکستان آنے کے ٹھیک ڈھائی سال بعد۔ لیکن پاکستان میں ان کا رہنا بہت ہی مختصر عرصے کے لئے رہا کہ ستمبر ۱۹۶۵ء کی پہلی تاریخ کو وہ اپنی آمد کے پانچ ہفتے بعد ہی واپس ہندوستان چلے گئے تھے اپنی ناجائز (غیر قانونی) ہجرت کو قانونی بنانے کے لئے۔ ۱۹۶۶ء کے مئی میں وہ یکایک واپس کراچی پہنچ گئے۔ انہیں غیر متوقع طور پر دیکھ کر مجھے خوشی تو بے پناہ ہوئی لیکن دل درد سے چیخ اٹھا اپنی شکست و ریخت اور مایوسی کی تصویر حبیب کے اس وقت کے پیکر سے زیادہ متاثر کن نہیں ہوسکتی تھی۔ تنویر جاوید اب تک انڈیا ہی میں زیر تعلیم تھے انہیں ساتھ لانا بھی اس وقت ممکن نہ ہوسکا تھا۔ میرے پاس صرف ناہید اور ندیم تھے۔ دونوں کا داخلہ میں نے اسکول میں کروادیا تھا۔ کالج سے جو تنخواہ ملتی وہ کفایت شعاری کے ساتھ اخراجات کے لئے کافی تھی۔ ہم نے بہادر آباد میں مکان کرایہ پر لیا تھا کرایہ سو روپیہ مہینہ تھا پی۔ای۔سی۔ایچ۔ایس کالج کبھی بس سے جاتے کبھی پیدل عموماً" تنخواہ ملنے کے پہلے دو ہفتے بعد تک کالج بس سے جاتے تھے جس کا کرایہ ان دنوں ایک طرف کا نو پیسہ ہوتا تھا۔ مہینہ کے باقی دنوں میں بس کا روزانہ اٹھارہ پیسہ بچا کر گوشت اور سبزی لایا کرتے تھے۔ تنخواہ تھی ساڑھے تین سو روپیہ۔ ۳۵ روپیہ مہینہ پراوڈنٹ فنڈ کٹتا تھا چنانچہ کرایہ مکان کا ادا کرکے ہاتھ میں دو سو پندرہ روپے بچتے تھے۔ بچوں کی اسی میں فیس، کھانا، کپڑا، بہرحال مفلوک الحالی سے دال روٹی پورا کرنے کے لئے بہت نہیں تو کم بھی نہ تھا۔ حبیب واپس آئے تو کچھ تگ ودو کے بعد ایک سگریٹ کمپنی میں اچھی تو نہیں لیکن تنخواہ کے لحاظ سے غنیمت نوکری مل گئی جو ان کے لئے پیغام اجل بھی ثابت ہوئی کہ چند مہینوں کے اندر ہی پھیپھڑے بری طرح تمباکو کی آلودگی سے متاثر ہوکر کینسر کا شکار ہوگئے۔

حبیب کی پوسٹنگ مردان میں ہوئی امید تھی کہ جلد کراچی آجائیں گے چنانچہ ہم دونوں کا متفقہ فیصلہ ہوا کہ میں کراچی میں اپنی کالج کی نوکری اور بچوں کے ساتھ رہوں تاوقتیکہ ان کی پوسٹنگ کراچی نہ ہوجاتی ہے۔ تب تک تنویر اور جاوید بھی انڈیا سے آگئے اور تنویر کا داخلہ پشاور انجینئرنگ یونیورسٹی میں ہوگیا ناہید اور ندیم کراچی ہی میں اسکول میں پڑھتے تھے۔ ہمارے گھر میں ٹیلی فون نہیں تھا لیکن ہم ہر روز ایک دوسرے کو خط لکھتے رہتے تھے خط کیا ہوتا تھا اپنے مسائل اور کاموں کی روزانہ کی رپورٹ ہوتی تھی۔ تنویر تو پشاور میں تھا۔ اس لئے ہر چھٹی کے روز باپ بیٹا کا ساتھ ہوجاتا تھا جاوید اور ناہید' ندیم میرے پاس کراچی میں۔ دسمبر ۱۹۶۷ء میں حبیب کراچی ایک مہینہ کی فرصت میں آئے اور ایک ہفتے کے اندر ہی بیمار پڑے مرض کی تشخیص سے انتقال تک تین ہفتہ کا وقفہ ہوا انہیں پھیپھڑوں کا کینسر ہوا تھا۔ کبھی کبھی انسان کے دل یا زبان پر ایسی بات آجاتی ہے کہ جو بعد میں پیشن گوئی بن کر صحیح ثابت ہوتی ہے۔ ۱۹۶۷ء کے جولائی میں حبیب مردان میں نوکری کے سلسلے میں تھے ہماری شادی کی سالگرہ ۱۶ جولائی کو ہوتی تھی اور یہ بھی محض اتفاق تھا کہ اب تک اس کی نوبت نہ آئی تھی کہ شادی کی سالگرہ کا کارڈ یا تار ایک دوسرے کو بھیجیں ہمیشہ ایک ساتھ رہنا ہوا۔ ۱۶جولائی رات دو بجے ڈاکیہ نے ایک تار اس مضمون کا دیا۔

"Congratulations on our marriage anniversy and for all the future aniversaries"

عجیب سا مضمون تھا مستقبل کی بشارت تو سنا تھا مگر مبارک باد نہ سنی تھی میرے استفسار پر بولے "بس میرا دل چاہا کہ تم کو ساری مبارکباد اکٹھا ہی دے دوں۔ میں وہمی یا توہم پرست نہیں ہوں اس لئے بات آئی گئی ہوگئی۔ اس کے کچھ ہی دنوں بعد کی بات ہے کہ ہم اپنے اخراجات اور آمدنی کا تخمینہ لگا رہے تھے اب تک جو جمع پونجی انڈیا سے آنے پر ڈوبی تھی اور جو مالی دھچکا لگا تھا اس کو لے کر ہم

نے کبھی کوئی ایسی بات نہیں کی تھی جس سے روپیہ ڈوبنے کے افسوس کا اظہار ہو سو اس روز بولے کہ اچھے برے وقت کے لئے ہمارے پاس کچھ جمع پونجی نہیں ہے۔ ویسے یہ اطمینان مجھے ہے کہ اگر میں ختم ہوگیا تو مجھے تمہاری صلاحیت پر اتنا بھروسہ ہے کہ تم اپنے آپ کو اور بچوں کو سنبھال لوگی۔ یہ سن کر پہلی بار ایک سیکنڈ کے لئے میرا دل دھڑکنا بھولا کیوں ان کے دل میں ایسی باتیں آتی ہیں۔ شگون بد شگون تو میں مانتی ہی نہیں سو یہ کہہ کر بھی ان کی زبان بند کرنے کی کوشش نہ کی کہ آپ کیوں ایسی باتیں کرتے ہیں چنانچہ جو پیشن گوئی انہوں نے کی تھی وہ تو بعینہ پوری ہوئی۔ میں نے بچوں کو تو سنبھالا ہی خود کو بھی ناقابل یقین حد تک سنبھالا اور اب تک سنبھالے جا رہی ہوں۔

مسئلہ کشمیر اور مملکت خداداد پاکستان دونوں کا جنم توام کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا نہ مبالغہ کہ برصغیر کی تقسیم کے ساتھ ہی نفسیاتی طور پر یہ امید کرلی گئی تھی کہ بھلے ہی ریاست کا راجہ ہندو ہو لیکن مسلم اکثریت کے بل پر اس کا الحاق پاکستان کے ساتھ ہی ہونا ہے۔ ادھر مسلمان بادشاہ اور ہندو اکثریت والی ریاست حیدر آباد پر انڈیا کا ڈائریکٹ ایکشن شاہ نظام کی معزولی اور ہندوستان کے ساتھ الحاق نے اس نقطہ نظر کو اور توانائی بخشی۔ انڈیا میں رہنے والے مسلمان مذہبی یگانگت کی بنا پر کشمیر کا الحاق پاکستان سے ہونے کے خواہاں عام طور سے تھے لیکن اب جب کہ پاکستان بن گیا تھا اور انہوں نے ترک وطن کرنے کے بجائے انڈیا اپنے وطن میں ہی مرنے جینے کا فیصلہ کرلیا تھا تو انہیں اس بات کا بھی شدت سے احساس تھا کہ ان کی اپنی بقا اور انڈیا کی سیکولر ازم کے لئے ضروری ہے کہ کم از کم مسلم اکثریتی علاقہ کشمیر ہندوستان کا سیاسی جزو رہے۔ کشمیر انڈیا کا اٹوٹ انگ ہے یا نہیں اس سے قطع نظر ہندوستانی مسلمانوں کا اجتماعی' سیاسی اور مذہبی مفاد اسی میں تھا کہ کشمیر کا پرامن طریقے پر ہندوستان سے الحاق کرنے دیا جاتا۔ جیسے جیسے انڈیا اور پاکستان میں کشمیر کو لے کر خلیج بڑھتی گئی انڈیا میں سیکولرزم کو دھکا لگتا گیا اور نوبت آج یہ ہے کہ کھلم

کھلا سیکولرازم کے مزار وہاں بھی جگہ جگہ تعمیر ہو رہے ہیں۔ بے چارے ہندوستان کے اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں نے پاکستان کی تخلیق میں تن من دھن قربان کر دیا اور لیڈران امت سے یہ نہ پوچھا کہ پاکستان بننے کے بعد ان کا حشر کیا ہوگا۔ رہبران تو پہلے ہی عازم مملکت خداداد ہو گئے کہ انہیں تخریب پاکستان کا فرض انجام دینا تھا جس طرح مندر مسجد بنانے کے لئے اللہ کا نام لے کر پنڈت ملا عوام سے چندہ وصول کر کے سارا کچھ ڈکار لئے بغیر ہی ہضم کر جاتا ہے۔ اسی طرح انڈیا کے اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں کے جان و مال' عزت و آبرو کا چندہ لے کر ایک اسلامی ملک کی تخلیق گئی کچھ نے اپنا نام جاوداں کیا' کچھ نے چوری رشوت سے دولت کمائی۔ ہندوستان کے مسلمان چاہے شعوری طور پر تسلیم کریں یا نہ کریں لیکن مسئلہ کشمیر ایک Dillema بن کر رہ گیا ہے۔ ہندوستان کے ساتھ الحاق ہوتا ہے تو مسلم امہ کی رگ حمیت مجروح ہوتی ہے۔ پاکستان کے ساتھ ہوتا ہے تو ایک بار پھر انہیں اپنے خون کی ہولی کھیلنا پڑ سکتی ہے .... جانے ہم لوگوں نے کیوں اس کہاوت پر ایمان لایا ہوا تھا کہ "جو گرجتے ہیں وہ برستے نہیں" برسے اور اتنا برسے ۶۵ء کی پاک بھارت جنگ میں کہ دوسروں کے ساتھ ہمارا بھی بہت کچھ بہا لے گئے۔ یہ میری زندگی کا بڑا آزمائشی دور تھا حبیب انڈیا میں' میں تنہا بچوں کے ساتھ کراچی میں۔ انسان تو اکثر ہجوم میں بھی تنہا ہوتا ہے کہنے کو کئی بھائی دیور اور دوسرے نزدیکی عزیز و اقارب لیکن مجھے سب اجنبی وناآشنا لگتے تھے۔ تصنع اور بناوٹ بھرا اخلاق احساس برتری کا رویہ۔ بھارت پاکستان کی جنگ میں شاہین بچوں کی مدد کے لئے جب آسمان سے اترے ہوئے مددگار فرشتوں کی کہانیاں سننی پڑتیں تو خون کھول جاتا۔ چھوٹے بڑے سبھوں کا ہمہ وقتی موضوع سخن یہی ہوتا۔ ندیم (میرا چھوٹا بیٹا) حبیب کی غیر موجودگی میں بہت پریشان اور عدم تحفظ کا شکار تھا۔ اسے بڑی عمر کے بچوں نے کھیل کود کے دوران ڈرایا کہ تمہارا شاستری تو کمزور سا وزیراعظم ہے اسے ایوب خان شکست دے کر پورے ہندوستان پر قبضہ کر لیں گے۔ یکایک ہم نے دیکھا کہ ایک لڑکا بے

ہوش ندیم کو گود میں لے کر اندر آیا۔ ہوش آنے پر بچے کے منہ سے صرف یہی الفاظ نکل رہے تھے۔ لال گھٹ والے میرے پاپا اور ہم سبھوں کو مارڈالیں گے۔ اس کے اعتماد کے بحال ہونے میں مہینوں لگ گئے۔ خود میری حالت کہ ہر وقت ذہنی طور پر تیار رہتی تھی کہ کسی وقت بھی بھارت کا ایجنٹ کہہ کر لوگ مجھے گرفتار کرلیں گے۔ ستم ظریفی ملاحظہ ہو بھارت میں حبیب اور پاکستان میں میری حیثیت مشتبہ۔ وہاں ان پر شبہ پاکستان کے ایجنٹ کی حیثیت سے کیا گیا یہاں مجھ پر ہندوستان کے ایجنٹ کی حیثیت سے تو یوں ہوا کہ ۱۰ ستمبر ۱۹۶۵ء کو شام پانچ بجے ہمارے ایک عزیز جو حکومت پاکستان میں ایک کلیدی عہدے پر فائز تھے پہنچے اور کہا کہ جلدی سے تیار ہو جائے ہم نے سمجھا وہ مجھے گرفتار کرنے آئے ہیں حالانکہ بے چارے خاصے مخلص اور پیارے انسان تھے اور پولیس سے ان کا کوئی تعلق نہ تھا بہرحال مفروضوں کے پیچھے منطق کہاں ہوتی ہے۔ کوئی سوال کئے بغیر ہم نے کہا کپڑا بدلنے کی کیا ضرورت ہے اسی طرح چلتے ہیں بولے اس حلیہ میں! مزید سوال وجواب کے بعد یہ بات کھلی کہ وہ مجھے جیل نہیں بلکہ میرا دل بہلانے کے لئے کسی تفریحی پروگرام میں لے جارہے تھے۔

حبیب کے بعد

حبیب کے انتقال کے بعد میں بہت تنہا ہوگئی اور عرصہ تک بہت ساری دنیاوی ماحول سے بیگانہ ہوکر رہی لیکن چاروں بیٹوں کے مستقبل کی خاطر زندہ رہنا پڑا اور جدوجہد کرنے کا عزم لمحہ لمحہ کا ساتھی بن گیا تھا اور پھر حبیب کے اعتماد کو بھی ٹھیس نہیں پہنچانی تھی۔ پر اپنا حشر روبوٹ کی مانند ہوکر رہ گیا تھا۔ مشینی طور پر کام کرتی تھی۔ کالج پیدل بہادر آباد سے جاتی اور آتی تھی فاصلہ تقریباً چار پانچ فرلانگ گھر کے سامنے سے بس چلتی تھی جو کالج کے سامنے رکتی تھی ایک طرف کا کرایہ نو پیسے تھا لیکن اتنی عیاشی کی حیثیت کس کی تھی۔ آمدنی مختصر خرچ زیادہ نہ بچوں کے لئے ڈھنگ کے کپڑے بنا سکتی تھی نہ اپنے لئے۔ کالج میں چند جونیئر لیکچرار بہت دل جوئی کرتیں اور نارمل زندگی اور نارمل حیثیت کی طرف واپس لانے کی کوششیں کرتیں۔ ویسے بھی وقت تو بڑے سے بڑے زخم کو مندمل کرہی دیتا ہے لیکن یہ حلیہ درست کرنا ٹیڑھی کھیر تھی کہ اس کے لئے عزم نہیں مالی وسائل درکار ہوتے ہیں۔

حبیب کے انتقال کے بعد بس فوراً" ہی بعد مجھے لوگوں نے ' اپنے بھائیوں نے وہ جنہیں مجھ سے گہرا لگاؤ اور سچا پیار تھا' مجھ پر دباؤ ڈالنا شروع کیا کہ بلکہ یہ کہنا

زیادہ صحیح ہوگا کہ مجھے بہت تنگ کیا کہ میں اپنا کرایہ کا مکان چھوڑ کر ان کی کوٹھی بنگلہ میں ان کی زیر سرپرستی بچوں کو پروان چڑھاؤں اور اپنی زندگی بھائیوں کے تحفظ کے چھتر چھایا تلے گزاروں۔ اپنی دانست میں وہ اپنا سماجی' اخلاقی' مذہبی' روایتی اور شاید خون کے رشتہ کے مطالبات اور فرض نبھانے کی کوشش کررہے تھے شاید اس خوش فہمی میں تھے کہ اس طرح میرے غم اور میری گردش کا ایک حد تک وہ مداوا کرسکیں گے۔ وہی گھسی پٹی روایت بیوہ بہن کی سرپرستی بھائیوں کا فرض بنتا ہے۔ بڑے چھوٹے سبھی بھائی بضد کہ تنہا کیسے رہ سکوگی۔ مجھے تو جنم جنم سے ضدی کہا گیا تھا سو میری ایک نہیں سارے لوگوں کے اصرار پر غالب آگئی۔ ایک سستا سا مکان کرایہ کا تلاش کیا پھر بیوگی کا دکھ وجود کا کلنک بننے کے بجائے عورت ذات کی عظمت اور اس کے وقار کا پرچم بن گیا۔ کہیں مبطلے بھائی (مرحوم) سے ملاقات ہوئی تو پوچھا کہاں رہتی ہو؟ بتانے پر بڑی شفقت سے بولے کہ اطہر کے ساتھ رہنے میں کیا قباحت ہے؟ بھائی تمہارا تمہیں بہت چاہتا ہے تمہیں تحفظ کی ضرورت ہے۔ "مبطلے بھائی تحفظ کی ضرورت بے کس کو ہوتی ہے بیوہ کو نہیں۔" میں نے تڑسے کہا۔

وقت گزرتا رہا۔ تنویر نے تعلیم مکمل کرلی۔ یکے بعد دیگرے چاروں جاوید' ناہید اور ندیم بھی کینیڈا سدھارے اور میرے مالی حالات بد سے بہتر کی طرف پلٹا کھاتے رہے۔ ۱۹۷۹ء میں شریعت کے علم بردار حکمرانوں کے طفیل نوکری سے نکال دیئے گئے ہم نے ۱۹۶۴ء میں کلکتہ سے لاگریجویشن کیا تھا اور اسی سال کلکتہ ہائی کورٹ میں رجسٹر ہوئے تھے کہ شامت اعمال نے ہجرت کرادی سو پاکستانی قاعدے قانون کی رو سے ایک سال سینئر ایڈوکیٹ کے ساتھ کام کرکے اور زبانی امتحان دے کر ایڈووکیٹ ہوگئے۔ ۱۹۷۹ء میں نوکری سے نکالے جانے کے بعد زندگی اور تجربات کا نیا دور شروع ہوا۔ ایک طرح سے آزادی کا احساس ہوا مگر اس درمیان سیاست سے جی بالکل کھٹا ہوگیا۔ زبان زد عام مقولہ ہے کہ "سیاست غنڈوں کا پیشہ ہے" لگتا تھا کہ پاکستان کے سیاسی لیڈروں کے لئے ہی بنا تھا شروع میں میرا تعلق جن

سیاسی افراد سے ہوا ان سبھوں کا تعلق بائیں بازو سے تھا۔ ڈیموکریٹک ویمن ایسوسی ایشن سے بھی واسطہ رہا تادم تحریر سندھ کی شاخ کی صدر رہی پھر سوویت یونین کے ختم ہونے کے بعد ایسوسی ایشن بھی بے جان ہوگئی جو سوویت یونین کے نام کی وجہ سے تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ ہماری تنظیم یتیم ہوگئی ہے یتیم بچوں کی سرپرستی کرنے کے بعد یتیم انجمن کے لئے جذبۂ دل نے ساتھ چھوڑ دیا۔ مگر کوئی نہ کوئی مشغلہ تو ہاتھ میں چاہئے جس کے سہارے زندگی کی ناؤ کھینچی جاسکے۔ انسانی حقوق جمہوریت کی جنگ لڑنے کے لئے تو افراد اور انجمنوں کی کمی نہیں جہاں اور جنگوں کے ساتھ حصول اقتدار کی جنگ بھی لڑی جاتی ہے اور ہم نے تو بہت پہلے ہی ہتھیار ڈال دیئے تھے کہ وسائل میرے پاس کم تھے۔ بر سر تذکرہ جب پاکستان آئے تھے تو خوش فہمیاں تو دل میں بسا کر نہیں لائے تھے مگر امید یہ تھی کہ بقول دیگران یہ مملکت خداداد ہے حالانکہ شروع ہی سے مملکت خداداد کے بجائے مملکت فسادات ہی ثابت ہوئی۔ بانی پاکستان کے آخری دنوں اور بیماری کے دوران منافق ارباب حل و عقد نے ان کے ساتھ کیا برتاؤ کیا یہ کوئی ڈھکی چھپی بات یا راز نہیں۔ لیاقت علی خان لقمہ اجل بنائے گئے مسٹر جناح کو اپنی پہلی تقریر جس میں انہوں نے مملکت پاکستان کو غیر مذہبی ریاست اعلان کیا تھا اور کہا تھا کہ پاکستان میں حکومت کی نظروں میں مذہب کی بنیاد پر کسی تفریق کی گنجائش نہیں ہے کی سزا خاصی سخت بھگتنی پڑی۔ بہرحال ہم لوگ بھی کم از کم اس مغالطہ میں ضرور تھے کہ وہ بندہ خدا جو کلمہ گو ہونے کا دعویٰ کرتا ہے ارکان اقتدار مملکت اسلامیہ پاکستان کم از کم اس کے ساتھ تو مذہبی تعصب سے گریز کریں گے۔ رہی بات عمل کی تو اس کی بھی توفیق کسی میں نہیں پائی کہ دوسروں کا محاسبہ کرنے سے پہلے اپنے گریبان میں جھانک سکے۔ ہر پاکستانی ایک نئے اسلام کے جھنڈے کا علم بردار نظر آیا۔ مذہبی جماعتوں کا اصل کام ارتداد کے فتوےٰ بیچنا اور سیاسی اثر و رسوخ کمانا ٹھہرا۔ ان پڑھ عوام بے چارے بھانت بھانت کے ملا مونوی مفتی کے جال میں پھنستے رہے سوچ فکر و غور کے سارے دروازے پاکستان کے عام

محنت کش ایماندار مسلمانوں پر یہ کہہ کر بند کر دیئے گئے کہ ملا کی کسی ہدایت سے ہٹ کر سوچنا گناہ اور اسلام کے خلاف ہے۔ کہ ملا عربی زبان سے واقف تھے جو قرآن شریف کی زبان ہے۔ سو میں جب پاکستان آئی تو بے حد مایوسی کے ساتھ یہ محسوس کیا کہ سیکولرزم پاکستان کے وجود کے لئے پہلی اینٹ کی حیثیت رکھتا ہے۔ ورنہ غیر مسلم تو دور کی بات ہے یہ آپس ہی میں فروعی اختلافات کو بنیاد بنا کر جلد ہی ملی خودکشی کر بیٹھیں گے۔ وقت کے گزرنے کے ساتھ میرا خدشہ اپنی سچائی ثابت کر رہا ہے۔ خیر بت تو بت سے ٹوٹے کن کن تخریبی اثرات کا رونا روئیں۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران ہٹلر اور سولینی کو سارے آفات ارضی کی جڑ سمجھا اور اس خوش فہمی میں رہے کہ جرمنی اٹلی اور جاپان کو ہزیمت دے کر اس وقت کی اتحادی طاقتیں اس کرہ ارض کو جنت نظیر بنادیں گی۔ مگر بھلا جنت نظیر بنانا ہی ہوتا تو خالق کائنات نے آدم کو سزا دینے کے لئے دنیا ہی کیوں منتخب کی ہوتی۔ سو ہٹلر سولینی تو بظاہر کیفر کردار کو پہنچے۔ ۱۹۴۵ء کے موسم گرما (غالباً" جولائی میں) تو اریخ عالم نے ایک زبردست جست لگائی جس حشر کا انسان اپنی طاقت کے نشہ میں تصور بھی نہیں کرتا ہے وہ ہم لوگوں نے بے یقینی کے ساتھ سنا۔ سولینی کو قتل کر کے لاش کو گیس اسٹیشن پر لٹکا دیا گیا۔ ہٹلر اور اس کی محبوبہ نے خودکشی کرلی جنگ ختم ہوئی' جرمنی تقسیم ہوا۔ جاپان نے ہتھیار ڈالے اور فتح کا تمغہ اپنے سر پر سجانے کے لئے جاپان کے ہتھیار ڈالنے کے بعد امریکہ نے ہیروشیما اور ناگاساکی پر دنیا کا پہلا ایٹم بم گرایا کہ معصوم انسانوں کی آہوں سسکیوں اور آنے والی کتنی ہی نسلوں کے کرب کی بنیادوں پر دنیا کی اولیں طاقتور خوشحال اور غریب ملکوں کی مفلسی کو قرض کے شکنجہ میں کس کر ان کا استحصال کرنے والی طاقت بن کر ابھرے۔ سو اب اس کا کیا چرچا کریں کہ ان سارے تلخ حقائق اور شکوے شکایات کے باوجود بھی چاہے نسلی تشدد سے تحفظ کی ضرورت ہو یا مذہبی تشدد سے یا اپنے مقدس مقامات کے تحفظ کو خطرہ لاحق ہو یا بچوں کے محفوظ مستقبل کی تلاش ہو ہم آس بھری نظروں سے دیکھتے امریکہ ہی کی طرف

ہیں۔ روٹھتے ہیں اور منائے جائے بغیر ہاتھ پھیلا دیتے ہیں۔ پہلے سب سے بڑا عفریت (دوسری جنگ عظیم تک) نسلی تعصب سمجھ میں آتا تھا۔ اب تو معلوم ہوتا ہے کہ تواریخ کے مختلف ادوار میں انسانیت کو دبوچنے والا عفریت مختلف نسل عقیدہ رنگ روپ کے طاقت واقتدار کے بل بوتے پر پیدا ہوتے اور پروان چڑھتے رہے ہیں اس پس منظر میں یہ کلیہ اخذ کرنا کہ انسانی تواریخ اور کرہ ارض کے سفر میں بہت زیادہ ہی مماثلت غلط نہیں ہے۔ ہم زمین کے ایک خطے سے ناک کی سیدھ میں سفر کریں تو اسی جگہ واپس پہنچ جائیں گے جہاں سے سفر کا آغاز کیا تھا اسی طرح انسانی تواریخ کے اس دور سے اپنی تفتیش کا سفر شروع کیا جائے جسے انسان کا دور وحشت کہا جاتا ہے تو آج مختلف تہذیب وتمدن کی منازل سے گزرتے ہوئے ہم انسانی بہیمت کے اسی دور میں پہنچے ہوئے ہیں جو ہمارا ابتدائی زمانہ تھا نازی ازم اور فاشزم کو شکست دے کر اور لیگ کے ملبہ پر اقوام متحدہ کی بنیاد رکھ کر اقوام عالم نے بڑے اطمینان کی سانس لی تھی لیکن بہت جلد ہی مذاہب عالم میں ابھرتی ہوئی بنیاد پرستی کے تشدد نے ایک انتہائی خطرناک صورت حال سے انسانیت کو دوچار کر رکھا ہے۔

چنانچہ امن عالم ہی نہیں بلکہ انسان اور انسانیت کی بقاء کے لئے مذہبی بنیاد پرستی خواہ کسی مذہب کی بھی ہو زبردست خطرہ ہے۔ اس کی تنگ نظری' ہوس اقتدار اور رجعت پرستی کو مطمئن کرنا بہت مشکل لیکن ضروری ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ بنیاد پرستوں کا گروپ اپنی خوں آشامی اور تشدد کے ذریعے اپنے سے مخالف ہر فرد' ہر گروپ اور مذہب کو مٹا دینے کے درپے ہے۔ انسانی حقوق کا بہت چرچا ہے لیکن مذہبی منافرت کی جڑوں کی بھی خوب ہی آبیاری ہو رہی ہے اور یہ آبیاری کرنے والے اپنے غیر انسانی مذہبی رویہ کی طاقت پر انسانیت کو پائمال کرنے کے لئے ایک خوفناک طاقت بن کر ابھر رہے ہیں۔ ہندوستان جو اپنی تواریخ مزاج اور ضمیر کے لحاظ سے اہنسا اور عدم تشدد کا دیش مانا جاتا رہا ہے' یہاں بھی بنیاد پرستی کی جنون خیزی

نے اپنی جگہ بنانی شروع کردی ہے۔ مٹھی بھر عیسائی اقلیت کے ہندو بنیاد پرستوں کے ہاتھوں تشدد، موت اور بربریت کا شکار ہونے کی خبریں آرہی ہیں حالانکہ ہندومت میں جہاد اور مذہب کے پرچار کے لئے طاقت کے استعمال کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

اس برصغیر نے بہت سارے مذاہب کو جنم دیا اور انہیں پھلنے پھولنے کے لئے زرخیز ماحول میسر کیا۔ حد یہ ہے کہ باہر سے آئے ہوئے حملہ آوروں کا بھی غالباً فطری عدم تشدد کی بناء پر ان کا اور ان کے مذہب کا سواگت کیا۔ بہرحال امید کی آخری کرن تو ہر حال میں جلتے رہنا ہے۔ بنیاد پرستوں کو نہ تو اپنے ہم مذہب عوام کی حمایت حاصل ہے نہ عالمی برادری کی مٹھی بھر منفی اور تشدد پرست ذہن رکھنے والے افراد کو ساری دنیا کے امن وامان کو تہس نہس نہیں کرنے دیا جاسکتا۔ اس میں شک نہیں کہ مسلم ممالک میں بھی عوام کی اکثریت سیکولر سوچ رکھتی ہے۔ عرب ممالک کو دور حاضر کے ایک زبردست چیلنج کا سامنا ہے یہ چیلنج معاشی مسائل حل کرنے سائنس صنعت وحرفت اور علوم وفنون کی آبیاری سے ہٹ کر اپنے تدبر دور اندیشی اور فہم و فراست سے کام لے کر جمہوریت اور اسلام کے درمیان اجتہادی توازن پیدا کرنے کا چیلنج ہے۔ اسلام جمعہ کی ہفتہ وار چھٹی علاقوں پر قبضہ ہوائی جہازوں کے اغوا یا عورتوں کو جانوروں کی مانند ناک میں نکیل ڈال کر قید کرنے سے نہیں پھیلتا۔ بنیاد پرستوں کا رویہ ہر انسانی قیمتی تہذیبی سرمایہ کی شکست وریخت کا منظم وسیلہ ہے۔ مجھے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مذہب کا مثبت پیغام عقیدہ انسانیت صداقت بے غرضی محبت واخوت سارے کے سارے اصولوں عقیدوں اور اقدار کی دھجیاں بکھیر دی گئی ہیں۔ مذہب کیا ہے اسے متضاد اعتقادات واعمال کا ملغوبہ بنا رکھا ہے۔ ایک طرف تو زبانی دعویٰ یہ کہ مذہب انسانی سلامتی اور بھائی چارگی کا سبق دیتا ہے تو دوسری طرف مسلح جہاد پر زور، بے گناہوں کا خون بہانے کی تلقین کرتا بلکہ اکساتا۔

مولوی ملا کے لئے بچپن سے ہی میرے جذبات بڑے منفی تھے۔ عام اصطلاح

میں میرے والدین وہابی تھے۔ نذر ونیاز مقبروں پر حاضری وغیرہ بدعت سمجھی جاتی تھی۔ شب برات میں دوسرے گھروں کے مقابلے میں ہمارے گھر میں سناٹا رہتا تھا۔ آس پڑوس سے طرح طرح کے حلوؤں کی خوشبو اور پٹاخوں (آتش بازی) کی رونق دیکھ کر اور ان کی تفصیل سن کر دل بہت مچلتا تھا کہ بدعت ہو نہ ہو کم از کم حلوہ اور پھلجڑی تو نصیب میں ہوتی۔ بہرحال نتیجہ یہ ہوا کہ جیسے جیسے عمر اور عقل میں پختگی آتی گئی کیوں کیسے اور کیوں نہیں جیسے سوالات اور ان کے جوابات ملتے گئے چنانچہ بنیاد پرستی کی اصطلاح ایجاد ہونے سے بہت پہلے ہی اس طبقہ سے ذہنی طور سے اور اصولاً "وعقیدتاً" اختلاف کی جڑیں مستحکم ہو چکی تھیں اور یہ تو ہونا ہی تھا کہ جہاد کا جو خون آشام اور تشدد مفہوم مجھے ان بنیاد پرستوں کے اسلام اور شریعت میں ملا اس سے میں کبھی آشنا نہیں ہوئی تھی۔ ہمیں تو اذان کی آواز کے ساتھ ہی جہاد کی عظمت کا درس گھٹی میں پلایا گیا تھا۔ اذان کے ذریعے نومولود انسان کو آگاہ کردیا جاتا ہے کہ موت برحق ہے اذان اس کے جنازہ کے نماز کی ہو چکی ہے۔ اب صرف نماز جنازہ ہونا باقی ہے اور جہاد کی اہمیت تو یہ ذہن نشین کرائی گئی کہ جہاد تو نفس امارہ کے خلاف لڑنے کا نام ہے۔ جہاد تو ظلم، برائی اور تشدد کے خلاف مسلسل جدوجہد اور قربانی کا نام ہے۔ اللہ کے معصوم بندوں کا جنہیں نہ ملک گیری کی ہوس ہے اور نہ اقتدار حاصل کرنے سے ان کے خون سے ہولی کھیل کر اپنی ہوس جہانگیری پوری کرنے کا نام تو جہاد نہیں پاکستان کے باقاعدہ مطالبہ کے پہلے تک ہندوستان میں مسلمان یہ دعویٰ کرتے نہ تھکتے تھے کہ اسلام بزور شمشیر نہیں بلکہ اپنی عالمگیر صداقت کے بل پر پھیلا ہے اور سچ بھی یہی بات لگتی ہے کہ بزور تلوار مسلمان ہندوستان پر سینکڑوں برس حکومت کرنے کے لئے ہرگز کافی نہ ہوتے۔ لٹیروں کی بات الگ ہے جو مندروں کو سونا اور دولت حاصل کرنے کے لئے لوٹ گئے اور مسمار کیا سو آج تک ہم شہنشاہ اکبر کو مرتد اور محمد بن قاسم جیسوں کو غازی تسلیم نہ کرسکے۔

✪✪✪

مذہب کا سرٹیفکیٹ

آپ کا ذاتی مذہب اگر اسلام ہے تو پاکستان میں آپ کو حکومت سے ایک سرٹیفکیٹ حاصل کرنا ہوگا کہ آپ سچ بول رہے ہیں بھلے ہی آپ کا خمیر منافقت اور کذب سے گوندھا گیا ہو۔ اس سلسلے میں میرا اپنا ذاتی تجربہ عجیب ہونے کے ساتھ ساتھ عبرت انگیز بھی ہے۔ مجھے اپنے بیٹے تنویر کے پاس جدہ جانا تھا ملنے کے لئے۔ تھوڑی تگ ودو کے بعد تنویر نے میرے لئے وزٹنگ ویزا تو حاصل کرلیا اب میری اپنی معلومات کے مطابق پاسپورٹ پر سعودی ایمبسی سے ویزہ کی مہر لگوانی تھی۔ ہم نے اب تک مشرق وسطیٰ کا کوئی ملک نہیں دیکھا تھا سو اس سفر کے لئے بہت اشتیاق اور تجسس تھا چنانچہ وہ کاغذ جس کی بنیاد پر کراچی سے ویزہ کی مہر لگنی تھی' لے کر سعودی ایمبسی پہنچی۔ اپنی باری آنے پر ویزہ کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے شخص نے مجھ سے مذہب کے سرٹیفکیٹ کا مطالبہ کیا۔ فارم جو ہمیں ملا تھا اس میں حلفیہ بیان کے ساتھ اپنا مذہب لکھنا تھا۔ سو ہم نے حلفیہ بیان کے ساتھ اپنا مذہب اسلام لکھ دیا تھا اور مزید یہ بھی حلفیہ لکھا تھا کہ قادیانیوں کے عقیدے سے بھی میرے اسلامی عقیدہ کو کوئی تعلق نہیں ہے چنانچہ ہم نے یہ سمجھ کر یہ بے چارہ انتہائی مشغولیت کی وجہ سے

میرا حلفیہ بیان نہیں پڑھ سکا ہے' اسے پھر یاد دلایا کہ میرا حلفیہ بیان فارم میں پڑھ لے۔ وہ اکھڑ سا آدمی ہتھے سے اکھڑ گیا مذہب کا سرٹیفکیٹ لاؤ اس کے بغیر ویزہ نہیں لگے گا۔ مذہب اعتقاد اور عقیدے کا سرٹیفکیٹ ہمارے مملکت خداداد میں کیسے ملتا ہے سنئے..... غیروں کو محظوظ ہونے دیجئے اور مذاق اڑانے کا موقعہ دیجئے اور چاہے تو اپنا سر دھنئے۔ بہت دیر تک میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں اپنے مذہب کا سرٹیفکیٹ کہاں سے لاؤں میرے اپنے مذہب اور عقیدے کا سرٹیفکیٹ بھلا میرے علاوہ اور کون مجھے دے سکتا ہے۔ میں ایمبسی والے اس شخص کی خشمگیں نگاہوں اور جھلائے ہوئے تیور کی تاب نہ لا کر پیچھے ہٹ گئی اور ویزہ کے امیدوار دوسرے شخص سے جو ویزہ لے کر کامران وشادمان لوٹ رہے تھے' مذہب کے سرٹیفکیٹ کا راز پوچھا۔ پتہ چلا کہ فارن آفس سے یہ سرٹیفکیٹ حاصل کرنا ہے۔ احمدی اور قادیانیوں کے اعتقادات سے میرا تو کوئی واسطہ نہیں جہاں تک مجھے اپنے عقیدہ کا علم ہے تو بھلا فورن آفس والوں کو میرے اعتقاد اور عقیدہ کا کیسے پتہ ہوگا۔ ویسے "کیسے پتہ" کا معمہ فورن آفس پہنچنے پر حل ہوا۔

میں جیسے ہی فورن آفس کی سرحد میں داخل ہوئی ایک جم غفیر نے ہر طرف سے میری گاڑی پر دھاوا بول دیا۔ میں گھبرا گئی کہ شاید میں نے کسی بے چارے کو کچل دیا ہے لیکن جب مارو' پکڑو' بھاگنے نہ پائے کی صدا کے بجائے ہر طرف سے یہ آواز سنائی دینے لگی کہ آپ کو مذہب کا سرٹیفکیٹ چاہئے۔ ادھر تشریف لایئے فوراً بن جائے گا اور بہت سستے میں تب ہمارے ہوش کچھ کچھ ٹھکانے آئے اور ہم نے بھاگنے کا ارادہ قطعی ناواجب اور بے موقع سمجھ کر نہ صرف ترک کر دیا بلکہ ان فرشتہ صفت افراد کے لئے بہت سارے کلمات تحسین بھی دل میں پیش کئے کہ ہم جیسے پریشان حال مسافروں کی مدد یہ لوگ کس خندہ پیشانی سے کر رہے ہیں۔ میرے استفسار کرنے پر کہ میرے مذہب کے سرٹیفکیٹ وہ لوگ کیسے بنوائیں گے ایک صاحب نے دوسرے سے آگے کھڑے ہوئے شخص کے سر پر سے اپنا منہ اونچا کر کے

فرمایا کہ سرٹیفکیٹ نکلوانا میرا کام ہے۔ صرف چار سو روپیہ خرچ آئے گا۔ شرمندگی اور غصہ سے (شرمندگی اس امر کی کہ میں نے سمجھے بوجھے بغیر ان دلالوں کو کلمات تحسین خدمت خلق کرنے پر کیوں پیش کردیئے) میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ بھلا جس ملک میں ایک مسلمان کو مسلمان ہونے کے ثبوت میں دلالوں کو رشوت دے کر حکومت سے سرٹیفکیٹ حاصل کرنا پڑے اس ملک کا نگہبان ہونے سے تو اللہ بھی انکار کردے گا۔ چنانچہ بڑی نفرت اور قہر بھری نظروں سے ہم نے ان دلالوں کو گھورا اور گاڑی سے اتر کر سیدھے اندر آفس میں محکمہ کے افسر اعلیٰ کے پاس پہنچ گئے۔ نام تو ان کا یاد نہیں لیکن اپنے آفس میں بغیر اپائنٹمنٹ گھس آنے کی پاداش میں اپنے آفس سے نکلوانے کے بجائے بہت انسانیت اور ہمدردی سے مجھے سمجھایا کہ اگر میں نے سرٹیفکیٹ حاصل کرنے کے لئے ان دلالوں کو رشوت نہ دی تو مجھے سخت پریشانی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ افسر صاحب نے یہ نہیں بتایا کہ اس رشوت میں ان کا کتنا حصہ ہوگا لیکن بات میری سمجھ میں خوب اچھی طرح آگئی چنانچہ واپس بھیگی بلی بنے آئے رقم دے کر مذہب کا سرٹیفکیٹ خریدا اور سعودی ایمبسی میں ویزہ لگوایا اور پیچ و تاب کھاتے ہوئے گھر واپس آئے کہ اسی روز رات کی فلائٹ سے روانہ ہونا تھا۔

جدہ ہمیں پریوں کے دیش کی مانند خوبصورت لگا مہینہ بھر گھومتے پھرتے گزر گئے لیکن وہاں کی اصلی عورت کو نہ دیکھ سکے۔ مقامی عورتیں صرف شاپنگ مال میں نظر آئیں۔ تنویر سے اظہار مدعا کیا کہ ہم سعودی خواتین سے ملنا چاہتے ہیں کہ اندرون خانہ کچھ حالات کا علم بھی ہو سکے۔ سماجی سطح پر تو تنویر سے کسی عرب خاندان کی راہ و رسم نہ تھی اور اگر ہوتی بھی تو وہ ہمیں معلومات تو مہیا نہ کرسکتے جس کی مجھے چاہ تھی۔ بہرحال یہ فیصلہ ہوا کہ تنویر جس کمپنی کے لئے کام کرتے ہیں اس کے مالک کو مع بیوی (یا بیویوں) کے کھانے پر مدعو کریں۔ اب زبان کی مشکل آپڑی۔ کہ "زبان یار من عربی و من عربی نمیدانم" چنانچہ مدعوئین کے لئے ایسے خاندانوں کی

تلاش شروع ہوئی جہاں کی بیبیاں انگلش سے کم از کم کام چلاؤ حد تک آشنا ہوں۔ اس کے لئے یہ علم حاصل کرنا ضروری تھا کہ کون سے شیخ کی کون سی بیوی ہائی اسکول یا کالج کی فارغ التحصیل یا امریکہ پلٹ۔ چونیدہ پاپندہ تھوڑا پاپڑ بیلنے کے بعد یہ مسئلہ بھی حل ہوا اور تین انگریزی داں عربی بیویوں کے شوہروں کو مع ان کی بیگمات کے مدعو کیا گیا۔ سارا دن اس انتظام میں نکل گیا کہ عورتوں اور مردوں کے گھر میں داخلہ سے لے کر بیٹھنے اور کھانے کا انتظام اس خوبی سے کیا جائے کہ مردو جنس مخالف (غیر محرم) کا ایک دوسرے پر سایہ بھی نہ پڑ سکے۔ خود میں بہت زیادہ اکسائیٹڈ ہو رہی تھی کہ خالص عربی سعودی عورت سے ملنے اور بات چیت کرنے کا پہلا موقع ملنے والا تھا۔ بہرحال ان خواتین سے مل کر' باتیں کر کے خوشی ہوئی' مایوسی ہوئی' تعجب ہوا یا یہ ساری باتیں بیک وقت ہوئیں۔ اب تک فیصلہ نہ کر سکی ہوں۔

مہمان خواتین سر سے پیر تک حسین برقعوں یا عبایا میں ملبوس تھیں۔ عبایا کے اندر سے نہایت ہی بجلی گرانے والے حسن برآمد ہوئے کچھ تو فطری اور کچھ نہایت ہی چابکدستی سے کئے ہوئے میک اپ کے مرہون منت لباس کی وضع قطع تراش نہ پوچھئے۔ انگلش بولنے میں خاصی مہارت استفسار پر پتہ چلا کہ عموما" ہر سال گرمیوں کے چند ماہ امریکہ یا یورپ میں گزرتے ہیں۔ ہمیں یہ جاننے کی فکر تھی کہ کیا مغربی ممالک میں بھی یہ خواتین اسی طرح برقعوں میں ملبوس گھومتی ہیں معلوم ہوا کہ مغرب میں برقعہ اور پردہ کی پابندی نہیں کرنی پڑتی کہ خدایان مجازی اس حد تک یہ آزادی عارضی طور پر بیویوں کو دے دیتے ہیں۔ عورتیں صنف مخالف کی محکوم ہیں ذہنی طور بھی اور سماجی و معاشی طور پر بھی اس محکومیت کی زنجیر تو اب بڑی حد تک مغربی ممالک میں ٹوٹ چکی ہے لیکن تیسری دنیا اور ترقی پذیر ممالک میں تو اب بھی شدت کے ساتھ موجود ہے۔ اس محکومیت کا آغاز کیسے اور کیوں ہوا؟ ان سوالات کا حتمی جواب میرے خیال میں تقریبا اسی طرح ناممکن ہے جس طرح اس امر کا تواریخی لحاظ سے تعین کہ اس محکوم صنف کی تحریک مزاحمت کب شروع ہوئی۔

خاندان ذاتی ملکیت اور ریاست کا آغاز میں مارکس اینگلز نے عورتوں کی محکومیت کے اسباب و آغاز پر اپنے مخصوص طرز استدلال سے روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ اشتراکی تحریک کے علاوہ مغرب کی فیمنسٹ تحریک میں بھی اس نظریہ نے خاصی مقبولیت حاصل کی۔

سعودی عرب میں ان چند عورتوں سے گھر پر جو ملاقات ہوئی تو یہ تاثر ہوا کہ یہ خواتین مظلوم و مجبور کٹھ پتلیاں ضرور ہیں لیکن احساس وجذبہ خودداری ختم نہیں ہوا ہے ویسے مجروح ہو کر اس حالت میں پہنچ چکا ہے کہ "ہمہ تن داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم" زخم کی ٹیسیں تو موجود ہے لیکن ذہنوں پر یہ عقیدہ اللہ کے ٹھیکیداروں نے بٹھا رکھا ہے کہ اسلام نے مرد کو عورت پر فوقیت دے کر اس کی زندگی پر بھی کامل اختیار دے دیا ہے۔ سو بے چاریاں ایک طرف تو درد سے کراہتی ہیں اور دوسری طرف گناہ گار ہونے کے ڈر سے زبان نہیں کھولتیں۔ بہت سی باتیں جب ہم نے علم حاصل کرنے کے لئے سوالات کئے تو مجھے بتایا گیا کہ گھر کی چہار دیواری کے اندر چند مخفی اور پوشیدہ واقعات ہوتے ہیں جن کا گھر کی چہار دیواری سے باہر پہنچنا معاشرہ میں بہت معیوب تصور کیا جاتا ہے لیکن اب اکثر عرب ممالک کی خواتین نے بھی گویا جان ہتھیلی پر رکھ کر زبان کھولنا شروع کیا ہے اور آہستہ آہستہ یہ بات عیاں ہو رہی ہے کہ گھروں کے ان پوشیدہ حقائق کا راز یہ ہے کہ عرب ممالک کے بہت سارے خاندانوں میں بیویاں اپنے شوہروں یعنی خدائے مجازیوں کے ہاتھوں پٹتی رہی ہیں اور پٹتی ہیں۔ یہ پٹائی شرابی اور آوارہ شوہروں کے ہاتھوں نہیں بلکہ اپنے نام نہاد شرعی اور شوہری حق کے طفیل ہوتی ہے۔ یہ عورتیں تشدد سہنے اور برداشت کرنے پر مجبور ہیں اور اس گھریلو راز کو افشاں کئے بغیر کہ ان کے پاس کوئی دوسرا چارہ نہیں۔

عرب ممالک کے خاندانوں کی بہت سی ریتیں اور روایت ایسی ہیں جنہیں سن کر یقین کرنے میں اس لئے مشکل ہوتی رہی کہ ایک طرف تو سائنس کی محیرالعقل ایجادات ہیں دوسری جانب غیر عقلی نظریہ ناموس ہے اور ناموس بھی صرف عورت

کا چنانچہ آج بھی بہت سارے مسلم ممالک میں مثلاً لبنان، پاکستان، افغانستان وغیرہ ممالک میں گھریلو تشدد تحفظ ناموس کی خاطر باپ بھائی یا شوہر کے ہاتھوں عورتوں کا قتل بہت عام بات ہے اس طرح کے قتل کا چرچا میڈیا کے ذریعے بہت کم ہوتا ہے اس طرح تحفظ ناموس کو دوسرا خطرہ لاحق ہوجاتا ہے اور نہ تو اس قسم کے قتل یا تشدد کی قانونی گرفت ہوتی ہے ویسے جہاں چار عورتیں آپس میں مل بیٹھتی ہیں اپنی جنس یا اپنے آپ پر ہونے والی زیادتیوں اور مظالم کا دل کھول کر ایک دوسرے سے بیان کرتی ہیں ان غیر انسانی مظالم اور جرام کی رپورٹ اگر پولیس کو بھی دی جائے تو ایسا کرنا عبث ثابت ہوتا ہے کہ عوام کے جان ومال کے محافظ پولیس افسران یا خود سماج مردوں کے عورتوں پر تشدد کو ظالمانہ کارروائی نہیں سمجھتا۔ پاکستان، افغانستان، لبنان وغیرہ کی مانند اکثر عرب ممالک میں بھی شوہر، باپ، بھائی اگر اس شک کی بنا پر کہ عورت اپنی پسند سے شادی کرنا یا طلاق لینا چاہتی ہے یا کسی لڑکے کو روایات کے خلاف پسند کرتی ہے، قتل کردے تو اسے قتل کے قانون کا مجرم نہیں گردانا جاتا کیونکہ یہ تحفظ ناموس کی خاطر مرد کو ایسا قتل کرنے کا مجاز تسلیم کیا گیا ہے۔

زندگی اور مخالف موجیں

۱۹۵۶ء سے لے کر ۱۹۷۹ء تک کا عرصہ پلک جھپکتے میں گزارا یا صدیاں بن کر بیتا' فیصلہ مشکل ہے۔ وقت کٹھن ہو یا خوش گوار گزر ہی جاتا ہے زخم وقت کے مرہم سے بھر جاتا ہے لیکن نشان اور گاہے گاہے کی ٹیس چھوڑ جاتا ہے سو بچے اس دوران پڑھ لکھ کر زندگی کی شاہراہ پر چل نکلے اور یکے بعد دیگرے سبھوں کی شادیاں بھی ہوتی گئیں۔

زندگی سے منہ موڑ کر زندہ رہنا کتنا ناممکن ہے یہ تو اتنے برسوں تک زندگی کو برت کر سیکھ اور سمجھ لیا تھا۔ صرف جہد اور تیاگ کے سہارے بھی تو نہیں جیا جاسکتا چنانچہ آہستہ آہستہ زندگی کی نارمل شاہراہ پر قدم واپس آنے لگے۔ بچوں کا تقاضا شدید سے شدید تر ہوتا گیا کہ اب جب کہ انہوں نے اپنا مستقبل کینڈا سے وابستہ کرلیا ہے میں پھر ایک ہجرت کر کے کینڈا مستقل شفٹ ہوجاؤں مگر میں اپنے آپ کو اس کے لئے تیار نہ کرپاتی۔ تقریباً اٹھارہ سال میں نے کراچی میں تنہا رہ کر گزارے ۱۹۷۶ء تک بہادر آباد کراچی میں کرایہ کے مختلف مکانوں میں گزارہ کیا۔ ۱۹۷۵ء میں نارتھ ناظم آباد میں اپنا مکان بنوایا تو ایک منزل کرایہ پر دے کر دوسری منزل پر خود

شفٹ ہوگئی یہ مکان میں نے اپنا خون پسینہ بہا کر بنایا تھا جب پہلے روز وہاں منتقل ہوئی تو شدید جذباتیت اور یاسیت کے نرغے میں تھی حبیب یاد تو آتے ہی رہتے ہیں لیکن اس روز بہت یاد آئے بچوں میں سے کوئی پاس نہیں۔ لکھتے ہوئے شرم آتی ہے لیکن میں نے کب انسانی کمزوریوں سے مبرا ہونے کا دعویٰ کیا؟ اس روز زندگی میں پہلی بار مجھے ڈر محسوس ہوا۔ وسیع و عریض مکان اور میں تن تنہا آہستہ آہستہ خود اعتمادی خوف پر حاوی ہوتی گئی اور میں نے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔

۱۹۷۹ء میں نوکری سے برخاست کئے جانے پر دوسرا ذہنی دھکہ لگا لیکن اس دھکا پر بھی اپنے کو سمجھا بجھا کر جلد ہی قابو پالیا۔ اس حقیقت اور احساس نے بڑا سہارا دیا کہ یہ اپنے نظریات اور نظریاتی سرگرمیوں کا شاخسانہ ہے اور جب اس نظریہ کی خاطر ۱۹۵۰ء میں ' میں حبیب کو جیتے جی کھونے کا حوصلہ کر بیٹھی تھی تو پی ای سی ایچ ایس کی کالج کی نوکری کی کیا حیثیت ہے۔

میں نے پہلے تذکرہ کیا ہے کہ ۱۹۶۵ء میں کلکتہ بار کونسل میں ہائی کورٹ ایڈووکیٹ کی حیثیت سے رجسٹر ہوگئی تھی۔ نوکری سے نکالے جانے کے بعد میں نے وکالت کرنے کا فیصلہ کیا۔ پاکستان میں قانون کی پریکٹس کے لئے کسی سینئر کے زیر نگرانی ٹریننگ شرط تھی سو یہ ٹریننگ میں نے اپنے بھائی علی امجد کے زیر نگرانی مکمل کی چنانچہ ایک بار پھر میرے چھوٹے بھائی کو میری استادی کا شرف حاصل ہوا۔ انہی دنوں ہندوستان پاکستان سے آمد و رفت کے لئے ویزے جاری ہونے لگے تھے۔ باقاعدہ پریکٹس شروع کرنے کے پہلے ہندوستان کا ایک چکر لگانے کے لئے دل مچلنے لگا کہ دل تو ہوتا ہی نادان ہے۔ ہندوستان سے آئے ہوئے پندرہ سال بیت گئے تھے اور کچھ غم جاناں کچھ غم دوراں دونوں ہی نے وہاں جانے کی آرزو ہی کو کچل رکھا تھا۔ ۱۹۸۰ء میں ویزہ مل گیا اتنے عرصہ تک پاکستان میں رہنے کے بعد ہم خیالوں کا اچھا خاصہ حلقہ بن چکا تھا۔ سیاست سے تو مکمل ناطہ توڑ لیا تھا کہ ویسے ہی ناکردہ گناہوں کے خمیازہ کے طور پر نوکری گنوا بیٹھی تھی لیکن جمہوریت پسند خواتین کے

صدر کی حیثیت سے عورتوں کی جاگھوتی کے حوالے سے سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے تھی کہ چور چوری سے جاتا ہے لیکن ہیرا پھیری سے نہیں۔ لیکن اب شدت سے یہ احساس پورے وجود کو اپنی لپیٹ میں لینے لگا تھا کہ نظریاتی جنگ صرف میں ہی نہیں بلکہ ہمارے بڑے بڑے سورما کامریڈ بھی ہار چکے ہیں۔ ویسے دل کو سمجھانے کے لئے تو ہزار دلائل گڑھ لئے جاسکتے ہیں۔ انڈیا گئی تو وہاں بھی کایا پلٹ ہی سے واسطہ پڑا۔ ہندستان کے سیاسی ماحول ہندو قومیت کا عروج' بائیں بازو کی چپقلش اور اپنے نظریاتی جیون مرن کے ساتھی ہم خیال کامریڈوں کی طرز فکر نے مایوسی اور شکست خوردگی کا احساس اور گہرا کردیا۔ ڈاکٹر سین سے بحث ہوتی رہی مگر محبت اور خلوص سارے کامریڈ میں وہی ملا جو پہلے ملتا تھا کشوری بھائی ' چھوکودا جگناتھ' سین برج کشوربابو... نام گنواؤں تو دفتر کا دفتر سیاہ ہو جائے۔

بہرحال ۱۹۸۱ء میں پٹنہ جاکر مظفر نہ جاتی یہ کیسے ممکن تھا۔ زندگی کی رہگزر پر پہلا عملی قدم تو مظفرپور کی آب وہوا نے ہی سکھایا تھا۔ زندگی جو میرے لئے بازیچہ اطفال بھی رہی اور سنگرام بھی اپنے جیٹھ منجھلے بھیا (عطاالرحمٰن داوٗدی) کو پٹنہ پہنچنے کی خبردے دی تھی۔ وقت ہمارے پاس کم تھا سو میرے پہنچنے کے دوسرے روز ہی اپنی کار ہمارے مظفرپور جانے کے لئے بھیج دی۔ آخری بار مظفرپور ۱۹۶۵ء میں انڈیا چھوڑنے کے پہلے حبیب کی اماں سے الوداعی ملاقات کرنے گئی تھی ان دنوں پٹنہ سے مظفرپور جانے کے لئے مہندرو گھاٹ سے اسٹیمر کے ذریعے گنگا پار تقریباً دو ڈھائی گھنٹے میں پہنچتے تھے۔ اس گھاٹ کا نام ٹھیک سے یاد نہیں غالباً دیگھا گھاٹ کہتے ہیں۔ وہاں سے گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ بعد ٹرین ملتی تھی جو سون پور جنکشن ہوتی ہوئی حاجی پور پہنچاتی تھی۔ سون پور کے جنکشن کا بڑا رعب تھا کہ سنتے تھے کہ یہ دنیا کا طویل ترین جنکشن ہے۔ اب یہ پتہ نہیں کہ یہ دنیا بہار تک محدود تھی یا ہندوستان تک یا برطانوی نوآبادیات تک پھر دوسری ٹرین پکڑ کر آخرکار مظفرپور پہنچ ہی جاتے تھے۔ یہ پورا سفر تقریباً چھ گھنٹوں پر مشتمل ہوتا تھا۔ پٹنہ سے مظفرپور کے سفر میں یوں تو چھوٹے چھوٹے

ہالٹ یا اسٹیشن بہت ملتے تھے لیکن حاجی پور اور سون پور دو بڑے جنکشن تھے جنہوں نے ذہن پر ان مٹ تاثرات چھوڑے ہیں۔ اس زمانے کی باتیں آج خود کو بھی لگتا ہے کہ دو تین صدی پہلے کی باتیں ہوں۔ ایک بار اسکول سے ہم لوگوں کو باہر کی دنیا کی سیر کرنے کے لئے لے جایا گیا۔ جہاں سون پور جنکشن ہماری منزل تھی۔ آج اگر کسی دوسرے سیارے کی سیر کا موقع بھی مل جائے تو بھی وہ خوشی اور اکسائٹمنٹ نہ ہوگا جو تب ہوا تھا۔ ایک گاؤں میں ہم لوگ ٹھہرے اور سارا دن باغوں اور کھیتوں میں گھومتے رہے۔

حاجی پور کے کیلے جو چینا کیلے کہلاتے ہیں اپنی خوشبو اور ذائقہ میں لاجواب ہوا کرتے تھے۔ چھوٹے چھوٹے منے سے.... پندرہ سال بعد مظفرپور میں عطا الرحمٰن بھیا کے ہاں فرمائش کر کے کیلے کھائے تو بہت ساری گزری باتوں اور یادوں نے دھاوا بول دیا اور میں ماضی کی بھول بھلیوں میں کھو کر رہ گئی۔ بھیا حیران بھلا تمہیں کیلا اور کہیں نہیں ملتا جو حاجی پور کے کیلے۔ "ان میں کیا خاص مزہ ہے؟" بھیا بولے۔

بھیا آپ نے تو ساحل سے بھی طوفان کا نظارہ نہیں کیا ہے۔ ساری عمر طوفانوں سے لڑنے والوں کے لئے تو ساحل کی ریت کا ذرہ بھی پیارا ہوتا ہے۔

سون پور میں ہر سال عظیم الشان میلہ لگتا تھا۔ چرند' پرند' نسل نسل کے جانوروں سے لے کر عورتوں کی بھی خرید و فروخت ہوتی تھی۔ ہرمال مقابلتاً" سستا اور اچھا مل جاتا تھا۔ یہاں اب اختتام صدی پر سون پور کے میلہ کی کیا شہرت اور افادیت ہے لیکن ان دنوں تو ہر قسم کا شوق رکھنے والے وہاں پہنچتے تھے۔

انڈیا چھوڑنے کے چند سالوں بعد میں نے سنا کہ دریائے گنگا پر پل بن گیا ہے جس کی بدولت پٹنہ سے مظفرپور کا سفر بس یا کار کے ذریعے ممکن ہوگیا ہے۔ بس یا کار کے ذریعے راستہ صرف دو گھنٹہ میں طے ہوجاتا ہے اور اسٹیمر اور ٹرین کے جھنجھٹ سے بھی نجات۔ یہ الگ بات ہے کہ میرے تصور میں اسٹیمر اور ٹرین کا سفر آج بھی

اپنے پورے سہانے پن اور کشش کے ساتھ بسا ہوا ہے۔ مٹی کی کلھیا میں دو دو پیسے کی چائے اور مونگ پھلی چھیل چھیل کر کھاتے ہوئے نہ صرف یہ کہ سفر کی صعوبتوں کا احساس ہی نہ ہوتا تھا بلکہ اگر کوئی اس ساری تگ ودو کو سفر نمونہ حضر کہہ دیتا تو اس کی دماغی صحت پر شک وشبہ کی کوئی گنجائش باقی نہ رہ جاتی۔ انٹر کلاس ٹرین کا ڈبہ عورتوں، بچوں، ٹرنکوں، بستر بندوں گٹھریوں اور مونگ پھلی کے چھلکوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا بھی کہیں بھولا جا سکتا ہے۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب ہم کمیونسٹ پارٹی کی غیر قانونی سرگرمیوں کی پاداش میں زیر زمین انقلاب لانے کی سعی میں جتے ہوتے تھے مگر بھلا ہو ٹھیٹ (شاید) عورت پن کی امنگوں اور جذبہ شوق کا، میری بڑی نند صالحہ باجی کی لڑکی کی شادی بھاگلپور کے ایک گاؤں (جمگاؤں) میں ہو رہی تھی۔ پٹنہ اور دور دور سے عزیز واقارب شرکت کے لئے جا رہے تھے۔ شادی میں شرکت کی آتش شوق بجھائے نہ بجھی۔ اس وقت تک وہ واقعہ نہ ہوا تھا جس میں پولیس مجھے گرفتار کرنے پہنچی تھی اور میں نے کپڑوں کے بکس میں بند ہو کر اپنے آپ کو گرفتاری سے بچایا تھا۔ (زیتون کے تیل کے کنستر کے بجائے کپڑوں کے بکس میں بند ہو کر) اس لئے نہیں کہ جیل جانے سے بچ سکوں کہ جیل جانا تو بڑے اعزاز کی بات ہوا کرتی تھی بلکہ اصل محرک اس طفلانہ حرکت کا پارٹی کی تادیبی کارروائی سے بچنا تھا۔

خیر میں افسانہ بیان کر رہی تھی انڈر گراؤنڈ ہونے کے باوجود ٹرین کے ذریعے شادی میں شریک ہونے کا ولولہ اور پھر اس ولولہ کو عملی طور پر پایہ تکمیل تک پہنچانے کی حکمت عملی۔ بچپن سے لے کر شادی کے پہلے تک گھر اور اسکول کی چہار دیواری میں بند ضرور رہتے تھے مگر برقعہ پہننے کی ضرورت پیش نہ آئی تھی کہ اسکول یا عزیز رشتہ داروں کے یہاں جانے کے لئے پردہ والی گاڑی استعمال ہوتی تھی۔ روایت شکن سسرال کے طفیل جہیز تو نہیں ملا لیکن اقدار پرست میکہ سے ایک نہایت حسین ریشمی برقعہ ضرور ملا جسے پہنا کر مجھے اسٹیمر پر (ڈولی پر نہیں اور نہ بدائی کے گانوں کے

جلو میں) سسرال رخصت کیا گیا تھا۔ دو ہفتہ بعد جب مظفرپور سے پٹنہ واپس آنے لگی کہ میرا کالج کھل گیا تھا اور داخلہ شروع ہونے والا تھا اور ساتھ ہی حبیب کی چھٹیاں بھی ختم ہونے والی تھیں تو روانگی کے وقت برقعہ اسی طرح دن کے وقت چراغ لے کر تلاش کرنے کی نوبت آگئی جس طرح ایک مردحق نے سارے شہر میں چراغ لے کر ایک "انسان" کو تلاش کرنے کی ناکام کوشش کی تھی۔ بعد از تلاش بسیار حبیب نے اعلان کردیا کہ یقیناً برقعہ چوری ہوگیا ہے اور چونکہ حاجی پور جانے والی ٹرین اس کی بازیابی کا انتظار نہیں کرسکتی تھی اس لئے اب مجھے بغیر برقعہ اور بغیر پردہ والی گاڑی کے گھر سے بے پردہ ہی نکلنا پڑے گا ویسے برقعہ اغوا کرنے میں حبیب کا ہاتھ تھا۔ یہ تو مجھے یقین تھا لیکن ابا کے گھر اس ڈھٹائی کے ساتھ جانے کی ہمت نہ پڑ رہی تھی......

بہرحال "آمدم برسر مطلب" کہ برقعہ نے میری زندگی میں دو بار بڑے ڈرامیٹک انداز میں اپنا تاریخی اور انقلابی فریضہ انجام دیا۔ پہلی بار تو ہمیں بغیر اطلاع دیئے داغ مفارقت دے کر کہ اس کے بعد تو ہم نہایت ڈھٹائی سے بے باکی اور ڈنکے کی چوٹ پر بے پردہ ہوکر بال وپر استعمال کرنے لگے اور دوسری بار اپنی زیر زمین سرگرمیوں کی بدولت اپنی شناخت چھپانے اور سیاسی جرم کو پولیس کی نظروں سے بچانے کے لئے یعنی پٹنہ سے بھاگلپور شادی میں شرکت کے لئے جانے کے لئے ایک بہت ہی قابل اعتماد اور نظریاتی طور پر ہمدرد دوست کی کوششوں کے طفیل ایک برقعہ حاصل کرلیا اور اس کی اوٹ میں عورتوں کی انٹرکلاس میں بیٹھ کر بخیر و خوبی پولیس کی آنکھوں میں دھول جھونکتے ہوئے بھاگلپور شادی میں اپنی شرکت بابرکت سے رونق بخشنے کے لئے پہنچ گئے۔ کسی کو میرے آنے کی امید نہ تھی نہ اطلاع۔ حبیب بہن کی بیٹی کی شادی میں دو روز پہلے ہی پہنچ چکے تھے لوگ مجھے دیکھ کر پہلے خوش اور پھر حیران اور آخر میں سخت پریشان کہ کہیں شادی بیاہ کے گھر میں پولیس مجھے گرفتار کرنے پہنچ گئی تو کیا ہوگا۔

تو یادوں کا سفر بھی لہلہاتا ہوا شاداب نخلستان ہوتا ہے اور راستہ کتنا خوشگوار کہ برسوں کی میزان سے کتنا ہی فاصلہ طے کرلو نہ پیروں میں چھالے، نہ حلق میں کانٹے، نہ ذہن میں انتشار۔ چنانچہ بات شروع ہوئی تھی پٹنہ سے مظفرپور جانے کی۔ ۱۹۸۰ء میں اور پیچھے پہنچ گئی۔ ۱۹۵۰ء میں اس کے پہلے جب ۱۹۶۵ء میں پاکستان نقل مکانی کرنے کے پہلے ہم اور حبیب بچوں کے ساتھ حبیب کی اماں سے ملنے اور خدا حافظ کہنے گئے تھے۔ پاکستان سے انڈیا پندرہ سال بعد ہی جانا ہوا کہ پاکستان آتے ہی سر منڈاتے دھپا دھپ اولوں کی بارش جو شروع ہوئی تو ہوتی ہی رہی۔ دو بجے کے قریب گھر پہنچے منجھلے بھیا کا گھر شفیع منزل سے متصل تھا۔ شفیع منزل میں شاید تعمیر نو کا کام شروع ہونے والا تھا کہ جب ہم نے اسے دیکھا تو بالکل کھنڈر سا معلوم ہو رہا تھا۔ میرے دل میں تو وہی ہنستا بستا شفیع منزل تھا جہاں میں نے اپنے وجود کی ہنسی مسکراتی بساط پہلی بار بچھائی تھی۔ شہناز التمش ان کی دولہن اور شہناز کی بھو بھابی سبھوں نے پرتپاک خیر مقدم کیا۔ ان لوگوں کی محبت اور پیار نے دل میں بڑی درد بھری کسک پیدا کردی۔ حبیب کے پیاروں کے پیار کے ساگر میں اپنا آپ جسے اب تک ڈوبنے سے بچا رکھا تھا۔ ایک بار پھر لگا کہ ڈوب چلا۔ حبیب کی مادی موجودگی کا سراب جاگتے میں کھلی آنکھوں کے باوجود وہ خواب دکھانے لگا جو برسوں پہلے بکھر چکا تھا پھر جب آنسو تھمے اور ڈولتا ہوا دل قابو میں آیا تو چھوٹی چھوٹی باتیں اور واقعات دہرائے جانے لگے۔ ہاں ضبط کے بند جو سیلاب کے اندر ٹوٹے عطا الرحمٰن بھیا کا یہ کہہ کر مجھے گلے لگانا تھا کہ ارے آخر میرے حبیب کی جولاہا آہی گئی کہ حبیب مجھے جولا کہہ کر بلاتے تھے اور مجھے چھیڑنے کے لئے بھیا مجھے جولاہا کہتے تھے۔

مظفرپور میں تین دن رہے۔ "تشنگی ہے کہ بجھائے نہیں بجھتی" سردار (علی سردار جعفری) بڑھ گئی اور کوثر و تسنیم کی سوغات کے بعد جہاں ہم نے زندگی میں پہلی بار خود سے خریداری کی تھی وہ تھی لکھا رام کی کپڑوں کی دوکان۔ گھر اور اسکول کی چہار دیواری سے باہر نئی نویلی دلہن اور نجات یافتہ لڑکی کا باہر کی دنیا سے بغیر چادر

برقعہ کے لین دین۔ اس کی زندگی کا گویا پہلا تواریخی واقعہ تھا اور پھر تو یہ تواریخی واقعات یا حادثات سارے تدریجی مراحل اس انقلابی سرعت کے ساتھ طے کرتے چلے گئے کہ آج خود مجھ کو بڑی ہی مشکل سے یقین آتا ہے کہ یہ میں وہی آٹھ برس کی عمر سے ڈھائی گز کا دوپٹہ اوڑھنے والی لڑکی ہوں تو بھلا لکھا رام کی دوکان کیسے بھول سکتی ہوں۔ شام کی چائے سے فارغ ہو کر صبح زندگی والے شہر مظفرپور میں گھومنے اور عزیز و اقارب سے ملنے جلنے کا پروگرام بننے لگا تو میں نے بھیا سے لکھا رام کی دوکان پر چلنے کی فرمائش کردی۔ سبھی دنگ رہ گئے اتنی سی بات تو مشکل ہی سے سہی لیکن لوگوں کی سمجھ میں آجاتی تھی کہ حبیب کے تعلق کے رشتے ناطے اور ان کے بھائی بہن مجھے بہت عزیز ہیں لیکن بھلا وہ زہرا داؤدی جن کے سال کا بیشتر حصہ پچھلے کئی سالوں سے یورپ امریکہ مشرقی وسطیٰ اور مشرق بعید کی سیر و سیاحت میں گزرتا ہے جو دنیا کے بڑے سے بڑے شاپنگ مال اور پلازہ میں خریداری کرتی رہتی ہیں، انہیں ہندوستان کے صوبہ بہار کے شہر مظفرپور کی ایک پرانی کپڑوں کی دوکان کا نام نہ صرف یاد ہے بلکہ اسے جاکر دیکھنے اور وہاں سے خریداری کرنے کا بھی شوق ہے لیکن شاید منجھلے بھیا میرے جذبات کی گہرائیوں تک ایک جادوئی لمحہ میں پہنچ گئے اور پھر سارے اہم پروگراموں کو بالائے طاق رکھ کر ہم لکھا رام کی دوکان پر پہنچ گئے۔ منجھلے بھیا نے میرا تعارف دکان کے پروپرائٹر لکھا رام سے کرایا جو اب بہت بوڑھے ہو چکے تھے۔ ان کے دو لڑکے بھی دوکان پر تھے۔ میرے لئے بہت ساری ساڑھیاں خریدیں بلکہ ہر رنگ کی ساڑی جو انہیں پسند آئے بڑے ارمانوں سے میری طرف بڑھاتے..... یہ تو تمہیں ضرور پسند آئے گی جولاہا۔

لکھا رام کی دوکان سے زندگی کی پہلی خریداری کا تاثر اتنا انمٹ میرے لئے کیوں ثابت ہوا اور اتنی طویل مدت سے میرے ذہن میں کیوں چپٹا ہوا ہے اس کی نفسیاتی تحلیل مشکل نہیں۔ یہ اسکول میں داخلہ کے ابتدائی دنوں کی بات ہے جیسا کہ میں پہلے بیان کرچکی ہوں میرے منجھلے بھائی علی اسلم نے خاندانی روایت اور شرفاء

کے گھروں کی لڑکیوں کی عزت و آبرو کے نظریات و تصورات کو داؤ پر لگا کر ابا کو راضی کرکے میرا داخلہ اسکول میں کرایا تھا۔ ان دنوں تعلیم بالغاں کا بڑا چرچا تھا۔ بڑی عمر کے لوگوں کو معمولی لکھنا پڑھنا کیسے سکھایا جائے اس کی ٹریننگ دینے کے لئے ایک والنٹیر صاحب اسکول میں آتے تھے۔ سبھی لڑکیوں کی ہمت افزائی کی جاتی تھی کہ ان اسکول میں ان والنٹیر صاحب سے بالغوں کو پڑھانے کا ہنر سیکھ کر اپنے اپنے گھروں میں جو بھی آتے جاتے نوکر چاکر ہاتھ لگیں ان پر اپنے ہنر کی آزمائش کریں۔ بھیا نے ابا اماں سے کہہ رکھا تھا کہ اسکول میں کوئی مرد جھانک بھی نہیں سکتا۔ کلاس روم میں داخل ہونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا چنانچہ ہمارے داخلہ کے چند روز بعد ہی جب اسکول کی لڑکیاں ایک ہال میں جمع کی گئیں اور تعلیم بالغاں کے ٹریننگ کے استاد اندر داخل ہوئے تو میری تو جان ہی نکل گئی۔ شرعی یا غیر شرعی پردہ کے روندے جانے کا کس کافر کو پرواہ یا ملال تھا خوف تھا تو بس یہ کہ کہیں کسی ذریعہ سے ابا کو خبر ہو گئی کہ بیٹی تعلیم بالغاں کے نام پر گل کھلا رہی ہے تو پھر اسکول تو خواب وخیال ہی ہو کر رہ جائے گا۔ خیر میری خوش نصیبی ہے کہ ایسا کچھ نہ ہوا یعنی ابا کو میری بے پردہ سماجی خدمت کی بھنک بھی نہ ملی یہاں تک کہ وہ وقت بھی آگیا کہ ہم بے پردہ بے برقعہ شادی کے ایک ہفتے کے اندر بڑی بے حیائی کے ساتھ سر منہ کھولے خریداری بھی کر آئے۔

پھر تو ہندستان کا چکر تقریباً ہر سال ہی لگتا رہا۔ لیکن دو ہزار صدی کے آغاز میں میں نے بڑے دکھ کے ساتھ یہ بات شعوری طور پر تسلیم کی (جو لاشعور میں کچھ عرصے سے کچوکے لگا رہی تھی) کہ ہندوستان کی موجودہ سیاسی روش کے پیش نظر ہم جیسے خوابوں کی دنیا میں بسنے والے افراد ایسی جنگ لڑ رہے ہیں جس میں ہم لمحہ بہ لمحہ شکست اور پسپائی سے دوچار ہیں سیکولرازم تو انڈیا میں صدائے بازگشت کی حیثیت اختیار کر چلا ہے۔ مذہبی منافرت کا لاوا جانے کیوں اور کیسے ابل پڑا ہے ہمارا تو ایمان تھا اور ہے کہ منزل کی راہ میں اگر ایک قدم پیچھے ہٹنا پڑے تو اس سے دو قدم

آگے کی راہ ہموار ہو جاتی ہے۔ مگر ایسا کچھ ابھی تو ہونے کے آثار نظر نہیں آتے۔

بیسویں صدی کو رخصت کر کے صدی دو ہزار کو ہم نے انڈیا ہی میں خوش آمدید کہا۔ نئی صدی اور پرانی صدی کے سورج کی کرنوں میں ہمیں تو کوئی فرق پتہ نہ چلا بس ایک ذرا سا انڈین ہوائی جہاز کی ہائی جیکنگ نے تھوڑا دماغی سطح پر تہلکہ مچادیا۔ کمپیوٹر کی متوقع نااہلی کی بنا پر لوگ بدلتی صدی میں بہت سے ہوائی حادثات سے خائف ہو رہے تھے۔ خیر وہ سب کچھ تو نہ ہوا اور اگر یہ ہائی جیکنگ بھی نہ ہوتی تو نئی صدی کا سواگت جو بے چاری بیسویں صدی میں شمار ہوتی ہے نہ اکیسویں صدی میں بڑا پھسپھسا سا ہو کر رہ جاتا۔ ویسے سنہ ۲۰۰۰ء کو بیسویں اور اکیسویں صدی کا پل صراط کہنا مجھے زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ پیچھے بیسویں صدی ہے جسے چھوڑ آئے' پل صراط سے صحیح سالم گزر جائے تو آگے اکیسویں صدی ہے۔ اس کے تیور بھی انسانی فلاح' امن سکون' خوشحالی اور حقوق انسانی تک پہنچ کے نقطہ نظر سے کچھ امید افزاء نہیں معلوم ہو رہے ہیں۔ گویا ابھی عالم برزخ سے چھٹکارا محال ہے ویسے سائنسی ترقی' انکشافات اور ایجادات کے حوالے سے تو بیسویں صدی کو غیر معمولی طور پر اہم گردانا جا سکتا ہے۔ گزشتہ ایک صدی کے دوران سائنس نے اتنی دور رس اور تعجب خیز چھلانگیں لگائی ہیں اور اس قدر زیادہ نئی اور بظاہر انہونی معلومات اور کامیاب تجربے کئے ہیں کہ نہ صرف حیات و ممات کے بارے میں ہمارے بہت سے یقینی کلیات یکسر اپنی صداقت کھو بیٹھے ہیں بلکہ انسانی فطرت اس کا عمومی طور پر رویہ اور عمل کے بارے میں بھی اب کوئی رائے زنی کرنا مشکل ہے۔ مختصراً" یہ کہ کرہ ارض کے ذی شعور وحیوان ناطق کے حوالے سے بالکل ہی نئے نظریات و تصورات ہی نہیں بلکہ حقائق تک نے جنم لیا ہے۔ ان سب انقلابی تبدیلیوں کے باوجود بھی تعجب خیز امر یہ ہے کہ انسان (جو بہت جلد آثار قدیمہ کی حیثیت اختیار کرنے والا ہے) کو اس کا اندازہ نہیں ہے کہ وہ منزل سے کتنی دور بھٹک کر جا پڑا ہے اور کتنے گوناگوں مسائل سے اپنے وجود کو بھر لیا ہے اب جب کہ ہم دو ہزار

صدی مکمل کر کے چند مہینوں ہی میں تیسری ہزار یعنی اکیسویں صدی میں داخل ہونے والے ہیں یہ ساری تحقیقات 'سائنس کے انکشافات اور تجربے جن کا اثر میڈیسن' فزکس' علم فلکیات' علم نجوم' انسان' اس کی صحت اور نت نئے جنم لیتے امراض اور اسرار زندگی سے متعلق علوم۔ یہ سب اور بہت سارے دوسرے علوم انسان اور انسانیت کے دکھوں کا مداوا کیا کرتے انسان کی ہلاکت وتباہی دکھوں اور امراض میں روز بروز اضافہ اور شدت پیدا کر رہے ہیں۔ قحط اور سیلاب کی تباہ کاریاں اپنی جگہ پر ہیں ان کو تو روکا نہیں جاسکا لیکن آرام اور سردی گرمی سے بچاؤ کے لئے اوزون کی سطح میں چھید ضرور کرڈالے۔

۱۹۸۰ء کی دہائی کو طبی دنیا میں معجزات کا دور کہنا مبالغہ نہ ہوگا۔ اس دہائی میں پہلی بار مصنوعی انسان نے جنم لیا(ٹیسٹ ٹیوب بے بی) اہم اور زندگی قائم رکھنے والے اعضا کی پیوند کاری ماں کے رحم سے باہر چار ہفتے تک کا جنین پروان چڑھانے کے علاوہ بہت سارے دوسرے محیرالعقل کارنامے انجام پائے اور تعجب خیز شعبدوں نے اپنا جلوہ دکھایا دوسرے ہی دن فنا ہوجانے کے لئے نہیں بلکہ لمحہ بہ لمحہ نئی کرشمہ سازیوں کو جنم دینے کے لئے لیکن ان ساری انقلابی تبدیلیوں کے جلو میں اخلاقی اور انسانی رشتوں اور پیچیدگیوں کا ایک سمجھ میں نہ آنے والے سیلاب در آیا ہے۔ طبی میدان تحقیق و تفتیش اور ایجادات نے مروجہ عالمی اخلاقی اقدار کی دھجیاں بکھیر دی ہیں۔ جب کہ بایو ایتھکس کی تو ابھی کونپلیں پھوٹنے کے آثار بھی نمایاں نہیں ہوئے ہیں۔ اصولوں اور اقدار کا سوال ہی کہاں؟ تحقیق وایجاد کرنے والوں نے (فی زمانہ تو نام نہاد ہی کہنا مناسب ہوگا معترضین کی زبان بند کرنے کے لئے) بائیوب ایتھکس کی بات کرنا شروع تو کی ہے لیکن ابھی کسی استقلال و قرار کا کوئی امکان نہیں پایا جاتا کہ اس میدان میں ہر لمحہ دھماکہ خیزی سے وابستہ ہے۔ ہوش ربا تبدیلیاں اس قدر تیز رفتاری سے ہو رہی ہیں کہ ہر نئی ایجاد کو قدم بہ قدم ایک نیا اخلاقی معیار چاہئے۔ تعمیر انسان یعنی تخلیق ثانی کی ٹیکنالوجی جنین کا انجماد کا تجربہ' اعضا کی پیوند

کاری' وغیرہ تو اخلاقی ضابطہ عمل کی راہ تک ہی رہے تھے کہ اب کلوننگ کا نیا دیو یا کرشمہ آموجود ہوا۔

تو صورت حال یہ ہے کہ تہذیب و تمدن نیک و بد اخلاقی و غیر اخلاقی کی طویل ترین مسافت کے بعد اب جس موڑ پر یہ کاروان پہنچ گیا ہے اسے انسانی معاشرتی زندگی کا نقطہ آغاز کہا جاسکتا ہے یہ پہاڑوں کے کوہ اور درختوں کے تنوں میں رہنے والا اب رہتا تو کمپیوٹر کی لامحدود امکانات کی دنیا میں ہے لیکن انسانی دنیا اس کے جذبات و محسوسات' اس کی خوشی اور غم سے اس کا تعلق تقریباً ٹوٹ چکا ہے۔

ویسے آج ۲۰۰۰ء صدی میں وہ وقت بھی تصور سے پرے نہیں ہے جب ہمیں اس کی از سرنو تعریف اور وضاحت کرنا پڑے گی۔ کہ "آدم خاکی" سے ہماری کیا مراد ہے۔ یا موجودہ حیوان ناطق کو دوسرے ذی روح حیوانات سے "نطق" کی صلاحیت کے علاوہ اور کیسے ممیز کیا جاسکتا ہے۔ سائنس اپنی تحقیق و جستجو کی دوڑ میں اتنا بڑھ گیا ہے کہ ۔

ملے راہ میں کعبہ و دیر بھی
بڑھ گیا ان سے آگے بشر ہی تو ہے

(پرویز شاہدی)

برطانوی سائنس دان برائن ایپلائر (Bryen Appleyer) کہتے ہیں کہ' اگلی چند دہائیوں کے اندر دولت مند افراد اپنی ہونے والی اولاد کی حسب پسند حسب منشا گڑھائی کرا سکیں گے۔ بس یوں جیسے کمہار مٹی کی مورتی گڑھتا ہے یا جیسے طرح طرح کی گڑیائیں مشینوں کے ذریعے بنائی جاتی ہیں۔ دولت مند افراد اپنے بچوں کو آج بھی عام بچوں سے بالاتر معیار زندگی' تعلیم' سماجی مرتبہ' اعلیٰ معاشرتی' سیاسی اور معاشی سہولتیں فراہم کرتے ہیں اور کرنے میں حق بجانب ہیں اور انہیں کوئی مورد الزام نہیں ٹھہراتا کہ وہ اپنی حدود سے آگے بڑھ رہے ہیں پھر اگر یہ ہی

صاحبان استطاعت یا باحیثیت لوگ آج جنیٹک انجینئرنگ کے دور میں جو ہر منٹ تیزی سے نئی تبدیلیوں کی مظہر ہے اپنے بچوں کو جنیٹک انجینئرنگ کی مدد سے نہ صرف انسانی بیماریوں سے اور جذباتی کمزوریوں سے محفوظ بلکہ زیادہ ذہین زیادہ حسین یا اپنی پسند کے دیگر اوصاف و خصوصیات سے مزین کریں تو کیا حرج ہے اور ایسا کرنے کے پہلے اس کے اخلاقی و انسانی مضمرات پر کوئی کیوں غور کرے۔

ابھی زیادہ دن نہیں گزرے کہ روزن انسٹی ٹیوٹ (Rosin Institute) کے ڈائریکٹر وال مٹ (Wal Mut) نے اپنی ٹیم کے ہمراہ یہ انکشاف اور اعلان کرکے دنیا کو ششدر کردیا تھا کہ ایک ذی روح کو کلوننگ کے ذریعے پیدا کرنے میں جنیٹک انجینئرنگ کامیاب ہوگئی ہے اور یہ طریقہ کار جانوروں کی دیگر اقسام کے علاوہ انسانوں پر بھی کامیابی سے کیا جاسکتا ہے ویسے ڈاکٹر وال مٹ کی رائے میں کلوننگ کی ٹیکنیک کا عمل انسانوں کے لئے مناسب نہیں اور اس طرح کی انجینئرنگ پر بین الاقوامی سطح پر پابندی عائد ہونا چاہئے۔

بہت نکلے میرے ارماں

کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ ابن بطوطہ کے دور میں ہوتے تو ہمارا شمار بھی بڑے عظیم اور تواریخی اہمیت رکھنے والے ان مصاحبوں میں ہوتا جو دشت دشت کی خاک چھان کر اللہ کی پیدا کی ہوئی عریض دنیا اور اس دنیا کے مختلف ممالک کے لوگوں کے رہن سہن ' طریقوں ' تہذیب و عقائد کے بارے میں معلومات پہنچاتے رہے ہیں لیکن افسوس کہ ہماری سیاحت کا دور ہوائی جہاز پر پرواز اور اجسام فلکی پر کمندیں پھینکنے میں نہیں بلکہ چاند پر چہل قدمی کے دور میں شروع ہوتا ہے۔ مزید بدقسمتی یہ ہے کہ یہ ایسا عہد ہے جب کہ ہرا یرا غیرا نتھو خیرا اپنے وطن و دیش کی سرزمین کے لوگوں ' ان کی زبان ' رہن سہن ' تہذیب و تمدن و معاشرے سے بھلے ہی ناواقف اور بیگانہ ہو لیکن امریکہ ' یورپ سبھوں کے لئے گھر آنگن بن کر رہ گیا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اب نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ امریکہ یورپ (مشرقی وسطی تو خیر سرحد پار پاکستان ہی ہے کہ ملت اسلامیہ کی حکومت ہے) کے چپہ چپہ میں گھوم آئیں بلکہ ان کی زبان اور معاشرت کا عملی مظاہرہ بھی مکمل طور پر اپنی ظاہری رہائش و بود و باش کے ذریعے کریں تب بھی یہ ساری تگ و دو نہ صرف یہ کہ سیاحت کے زمرے میں شامل نہیں کی جائے

گی بلکہ ایسی تمنا کرنا بھی سیاحت کی توہین متصور ہوگی اور اپنی اتنی حیثیت اور بساط نہیں کہ چاند نگری کی سیر کر آئیں اور دوستوں اور عزیزوں کے لئے بھی معلومات کا ذخیرہ نہ سہی چاند کی مٹی ہی تھیلے میں بھر کر لا سکیں۔ بہرحال پرواز ہر کس بقدر اوست جتنی بھر قسمت' حالات اور پھر اپنے شوق جستجو نے یاوری کی' گھوم لئے اور کچھ تاثرات ومشاہدات اور کچھ اپنی دانست میں نئی معلومات اور کارآمد تجربات کا اندوختہ بھی اپنے دامن میں سمیٹ لائے جو کچھ دیکھا سنا اور سمجھا اور ان سے جن نتائج تک دل و دماغ نے رہنمائی کی وہ ان صفحات پر حاضر ہیں۔ میری نیت نہ ناصح بننے کی ہے نہ ناقد یا معترض پھر بھی انسانی ذہن چونکہ سوچ اور پرکھ کی صلاحیت رکھتا ہے اس لئے گردوپیش کے حالات ومشاہدات سے کچھ نہ کچھ نتائج اخذ کرنے پر مجبور ہے اور یہی میری مجبوری بھی ہے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ میری سوچ موجودہ سماجی معاشرتی اور انسانی رشتوں اور فرائض کے بارے میں اور میرا ردعمل اور نقطہ نظر کچھ لوگوں کے مزاج اور نظریہ سے متصادم ہو لیکن یہ تو معاملہ اپنی اپنی سوچ اور سمجھ کا ہے۔ بہرحال "این سعادت بزور بازو نیست" میں تھوڑی سی ترمیم کے ساتھ کہ "ہر سعادت بزور بازو نیست" دل کو تسلی دیے لیتے ہیں کہ نہ تو ابن بطوطہ کے دور میں پیدا ہونا اپنے بس کی بات تھی اور نہ مشیت ایزدی میں دخل اندازی کر کے ستاروں سے آگے کے جہانوں میں کمندیں پھینکنے کی استطاعت چنانچہ جتنے ممالک دیکھ لئے بس وہی کافی ہیں سیاحوں میں شمار کرانے کے لئے اور چونکہ منزل اب بھی گریزاں ہے اس لئے رخت سفر کو تو بندھے ہی رہنا ہے۔

ویسے ممالک اور مقامات تو ہم نے بہت سارے گھوم لئے اور دیکھ لئے بہت ساری جگہیں تو معزز مہمان کی حیثیت سے مدعو کئے گئے جیسے عراق' لیبیا' سوویت یونین وغیرہ اور میزبان ممالک کے خرچ پر سیاحت کا شوق پورا کیا۔ مگر وہ جو کہتے ہیں کہ ؎

"بہت نکلے میرے ارماں لیکن پھر بھی کم نکلے"

تو ابھی بھی بہت سے مقامات کھلی آنکھوں کے خواب بنے ہوئے ہیں۔
جب انگریزوں نے برصغیر کو نو آبادیاتی بنایا تو سب سے موثر طریقہ خام مال کی برآمد تھی۔ ان کی مشینوں کے بنے کپڑے بڑے جاذب نظر اور قیمتی ہوتے لیکن ملک زیادہ سے زیادہ غریب ہوتا چلا گیا۔ نو آبادی ہم اب بھی ہیں۔ اب اس خام مال کی برآمد ہمارے بچوں اور نوجوانوں کے دماغی اور ذہنی استعداد کی شکل میں ہو رہی ہے پہلے بدلہ میں تیار مال ملکی کاریگروں کو بے روزگار کر کے من مانی قیمت پر بیچتے تھے۔ اب ہمارے بچوں کی صلاحیتوں کی قیمت ڈالر اور جنگی اسلحہ جات کی شکل میں ملتی ہے۔ لڑاؤ اور حکومت کرو کی حکمت عملی پہلے بھی تھی اور اب بھی عالمی پیمانہ پر ہے۔ بہرحال اس برین ڈرین کے چکر میں میرے بچے کب بچ سکتے تھے سو جب چند برس کے اندر چاروں ہی "پتہ پتہ بوٹا بوٹا بھاگ رہا ہے گلشن سے" کے مصداق سات سمندر پار سدھار گئے تو میں کراچی میں بالکل تنہا رہ گئی۔

"اب کیسے رہو گی تنہا بچوں کو بھی تو روانہ کر دیا ایک کو تو پاس رکھا ہوتا۔" پاس پڑوس والوں نے، دوستوں نے گویا ترس کھا کر کہا۔

"ارے کیسے رہو گی بالکل تنہا...." عزیز رشتہ داروں نے فکر مند ہو کر کہا۔

"امی اب تو آپ کی نوکری بھی ختم ہو گئی چار بیٹوں کی ماں ہو کر آپ کراچی میں تنہا کیوں اور کیسے رہیں گی۔"

میرے بچوں نے کہا بہت ہی احساس ذمہ داری سے جب ان کی بات نہ مانی تب بھی کہا گئے کرب سے احساس لاچارگی سے۔

مگر میں ان کے احساسات و جذبات سے کب غافل رہی ہر ایک کا عہد طفلی نظروں کے آگے رہتا جب وہ نت نئی شرارتیں کرتے اور میں کبھی ہنس پڑتی اور کبھی غصہ کرتی تنویر کا وہ مٹی میں لت پت سراپا میں کبھی بھول سکتی ہوں جب وہ گرمیوں کی بھری دوپہر میں گھر کے پیچھے باغ میں انڈا بونے کی سعی میں مشغول تھا کہ جیسے ٹماٹر میں پھل آتے ہیں۔ اسی طرح انڈے میں بھی پھل آئیں گے اور پھر جاوید تصور کی

آنکھوں میں شکاگو سے آکھڑے ہوئے "ارے یہ تو ان کئی سالو میں کتنا بدل گیا ہے یہ وہی بچہ ہے جو بھیا سے لڑائی ہوتی تو روتے ہوئے میرے پاس آتے کہ بھیا نے مجھے گالی دی ہے۔ پوچھنے پر کہ بھیا نے کیا کہا ہے تو بولے میں نے سنا تھوڑی ہے دل ہی دل میں گالی دے رہے تھے۔

اور پھر ناہید شرارتی کہاں پیچھے رہنے والا چپکے سے کھانے کی پلیٹ اٹھا کر اس نے صحن میں دے ماری چھن چھنا چھن..... میں اس کی آواز سننے کی لالچ میں تصورات کی دنیا میں ہی رہی اور میں نے سنا کہ وہ امریکہ سے کہہ رہا تھا کہ امی غلطی ہو گئی آپ سے بھی تو غلطی ہو جاتی ہے دروازے پر گھنٹی بج رہی ہے لیکن میں آنکھیں کیسے کھولوں ابھی ندیم کہاں آیا ہے وہ تو گھر بھر کا لاڈلا ہے نا.... جانتا ہے کہ میں اسے دیکھے بغیر آنکھیں نہیں کھولوں گی۔ تم بہت ضدی ہو گئے ہو بیٹا میں نے کہا۔

"آپ نے تو مجھے ولال میں چوپت کردیا ہے۔" تب ندیم چار سال کا تھا اور ولار میں چوپٹ ہو کر بہت دنوں تتلایا گیا تھا۔

میرے بیٹے میرے چاروں لخت جگر دل تو میرا بھی چاہتا ہے تڑپتا ہے کہ تم لوگوں کے پاس آجاؤں تمہیں زندگی کی شاہراہ پر ترقی کرتے عمر کے ہر دور میں پہنچتے دیکھوں۔ لیکن میں نے اپنی زندگی کے کس دور میں اور کب اسے سچ مانا تھا کہ عورت کو ہمیشہ ایک مرد سرپرست کی ضرورت ہوتی ہے تو ہمارے اور ہمارے پیارے بچوں ہماری متاع حیات چار بیٹوں کے درمیان یہ سمجھوتہ ہوا کہ میں ایک بار پھر ہجرت کرکے ان کے اپنائے ہوئے دیس میں جابسوں لیکن معاہدہ کی ان کے نکاہ سے کڑی شرط یہ تھی کہ میں ان کی فرض شناسی اور اطمینان کے خراج کے طور پر کینیڈا تو آجاؤں لیکن اس شرط پر کہ ان میں سے کوئی بھی مجھ سے اپنے ساتھ رہنے پر اصرار نہ کریں گے سو سبھی بچے معاہدے کے فریق بنے کہ یہ ان کی مجبوری تھی دوسرا کوئی چارہ نہیں تھا۔

پینتیس سال پہلے رخت سفر باندھ کر پاکستان پہنچے تھے یہ رخت 1999ءمیں

کنیڈا اگر کھلا ہے۔ پہلی ہجرت ہندوستان سے پاکستان میری مرضی کے بغیر اپنے حبیب کو خوش کرنے کے لئے کی تھی۔ دوسری ہجرت اپنی کائنات اپنی متاع حیات میرے بچوں کا دل نہ ٹوٹے اس لئے کی لیکن دیکھئے زندگی کے دو اہم ترین اقدام میں فیصلہ کن کردار مرد ذات کا ہی رہا لیکن نہیں میں غلط کہہ گئی۔ پہلی بار فیصلہ مرد کی حاکیت نے نہیں بلکہ محبت اور قربانی نے کرایا تھا۔ دوسری بار بھی یہ فیصلے میری محبت میری ممتا کی مجبوری نے کرائے تھے' یہ پینتیس سال کیسے گزرے کن کن آزمائشوں اور ابتلاؤں سے واسطہ پڑا نپٹنا پڑا۔ شاید یہ اوراق ان کی کچھ نشاندہی کرسکیں میں تو صرف یہ کہہ سکتی ہوں اور مکمل یقین کے ساتھ کہ گو کہ منزل آج بھی گریزاں ہے لیکن "ہر داغ ہے دل میں بجز داغ ندامت"

ایک اخباری تبصرہ

گرداب کی شناوری

مصنفہ......زہرا داؤدی

ناشر......جاوداں پبلشرز، کراچی

صفحات......216

قیمت......150 روپے

ہمارے موجودہ معاشرے میں ہر شخص سچ کا مطالبہ بھی کرتا ہے اور سچ بولنے کا دعویدار بھی ہے، خواہ سیاست ہو یا ادب ہو، زندگی کا کوئی شعبہ بھی ہو، جس کو دیکھو وہ سچ کہنے اور لکھنے کا دعویٰ کرتا نظر آتا ہے۔ لیکن حقیقت میں کتنے لوگ ہیں جو سچ کے کانٹوں پر چلتے ہیں......؟ اس کا جواب دینا بہت مشکل ہے، اس وقت میرے سامنے جو کتاب ''گرداب کی شناوری'' کے نام سے ہے، یہ ایک ایسی خاتون کی داستانِ حیات ہے جس نے سچ کی خاطر بڑے مصائب جھیلے۔ زہرا داؤدی قانون دان بھی ہیں اور ماہرِ تعلیم بھی ہیں انہوں نے درس وتدریس کا پیشہ بھی اپنایا اور قانون کے شعبے سے بھی ان کا تعلق رہا اور ہے لیکن وہ جہاں بھی ہوتی ہیں، اپنے نظریے کے اظہار میں منافقت سے کام نہیں لیتیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ ابتداء ہی سے وہ ترقی پسند تحریکوں سے وابستہ رہی ہیں اور انہوں نے اپنی زندگی کی جدوجہد کا آغاز ایک ایسے بائیں بازو کی پارٹی سے کیا جس کی زندگی کا مقصد مفلس اور مظلوم لوگوں کی خدمت کرنا ہے وہ آج بھی ڈیموکریٹک ویمن ایسوسی ایشن سندھ کی صدر ہیں اور مجبور و بے بس خواتین کو بلا معاوضہ مشورے دینے کی خدمات انجام دے رہی ہیں۔ اپنی اس آپ بیتی ''گرداب کی شناوری'' میں انہوں نے اپنی ابتدائی زندگی سے لے کر اب تک کے حالات تحریر کیے ہیں اور یہ بتایا ہے کہ انہیں ترقی پسند نظریات پر قائم رہنے کے لئے کن کن مشکلات سے دوچار ہونا پڑا ہے اپنی زندگی کے حالات کے ساتھ ساتھ انہوں نے بعض ان سماجی، معاشی اور سیاسی مسائل پر بھی اظہارِ خیال کیا ہے اور بعض دیگر ممالک مثلاً ملائیشیا، جاپان، افغانستان، عراق، لیبیا، بھارت اور ساؤتھ افریقہ وغیرہ کے حالات کے تناظر میں بھی بات کی ہے، اس

کے علاوہ آج کی جدید اور سائنسی دنیا کے انکشافات اور نظریات و ایجادات کے بارے میں بھی لکھا ہے۔ زہرا داؤدی صاحبہ کئی بیرونی ممالک میں بھی گئی ہیں لہٰذا انہوں نے وہاں کی زندگی اور سماج کے متعلق بھی اپنے خیالات تحریر کیے ہیں مگر ان سب کا جائزہ لیتے ہوئے ان کے ترقی پسند نظریات ان کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔

'گرداب کی شناوری'..................ایک مطالعہ

پروفیسر علیم اللہ حالی

زہرا داؤدی برصغیر پاک و ہند میں ایک نہایت نمایاں جری، باہمت، پُرعزم، حوصلہ مند اور نظریات و تصورات کے لحاظ سے مستحکم خاتون کی طرح جانی پہچانی جاتی ہیں۔ ان کی شخصیت ان کی اکیلی ذات کی کہانی نہیں بلکہ ایک معاشرے، ماحول اور ایک عہد کی تاریخ ہے۔ ابھی حال ہیں میں ان کی خودنوشت سوانح 'گرداب کی شناوری' کے نام سے شائع ہوئی ہے جو اپنے طور پر گذشتہ پچاس ساٹھ برس کے تغیرات کی داستان سناتی ہے۔ ریاست بہار کو اس بات پر فخر رہے گا کہ یہ مثالی خاتون اسی سرزمین کی پیداوار ہیں۔

آج جب لوگ ہند و پاک کے پچاس ساٹھ برس پہلے کی سماجی، تہذیبی اور انقلابی صورتحال کو بھولنے لگے ہیں اور ان کے دلوں سے احتجاج و انقلاب اور تبدیلی و تغیر کے وہ نقوش مٹتے جا رہے ہیں جو ہندوستان کی آزادی اور پاکستان کے قیام کے دنوں میں رونما ہوئے تھے یہ کتاب داستانِ پارینہ کی بازخوانی کا ایک اچھا وسیلہ فراہم کرتی ہے۔ برصغیر میں ترقی پسند تصورات کی پرورش بالخصوص مارکسی نظریات کی توسیع و اشاعت نیز انہیں عملی زندگی میں اتارنے کی جدوجہد کا جو ماحول تھا وہ اگرچہ خواب و خیال ہو چکا ہے مگر ابتدائے عشق کے وہ دل سوز واقعات پڑھنے اور سننے والوں کو آج بھی متاثر کرنے کے لئے کافی ہیں۔

آپ بیتی کے لئے بنیادی شرائط یہ ہیں کہ ایک طرف اس سے لکھنے والے کی شخصیت پورے طور پر روشن ہو جائے اور اس کی زندگی شروع سے اخیر تک آئینے کی طرح شفاف ہو جائے اور ساتھ ہی ساتھ اس کے عہد کے تمام آثار و واقعات بھی منکشف ہو جائیں اور یوں آپ بیتی محض آپ بیتی نہیں رہتی بلکہ جگ بیتی بن جاتی ہے۔ 'گرداب کی شناوری' کی مصنفہ نے اسے ایک سیاسی اور تہذیبی دستاویز بنا کر

تاریخ کے ایک باب کو زندہ جاوید بنادیا ہے۔

زہرا داؤدی کے پاس فکر وعمل کی سچائی کی وہ دولت ہے جو بہتوں کو نصیب نہیں۔ ان کی زندگی ایک کھلی کتاب کی طرح 'گرداب کی شناوری' میں حق گوئی کی ایک زندہ مثال بن کر سامنے آگئی ہے سچ بولنے کی عادت میں وہ غالباً یہ بھی فراموش کرگئی ہیں کہ ہجرت کے بعد آج کے ملکی ماحول میں انہیں اپنی زندگی کے کچھ حقائق پر مصلحتاً پردہ پوشی بھی کرنی چاہیئے تھی۔ ماحول کے تقاضوں اور مصلحتوں کو بالائے طاق رکھ کر اپنے دل کی بات واضح طور پر بیان کردینے کی جرات زہرا داؤدی کی شخصیت سے اور بھی متاثر کرتی ہے 'میں جو کہوں گا سچ کہوں گا اور سچ کے علاوہ کچھ بھی نہیں' کہنے کا دعویٰ کرنے والے بیشتر افراد کی تحریریں مصلحت کے تہہ در تہہ غلافوں میں چھپی ہوئی ملتی ہیں۔ بخلاف اس کے مصنفہ نے تمام خدشات وخطرات سے بے پروا ہو کر اور اقتدار سے ملنے والے مراعات واعزاز کو ٹھکرا کر جو کچھ لکھا ہے اس پر تعذیر وتوبیخ کا اندیشہ منڈلاتا رہتا ہے لیکن جرات کسی شئے کو خاطر میں نہیں لاتی۔

زہرا داؤدی کا انداز فکر سائنسی ہے۔ وہ تعقل اور فکر کی قائل ہیں، ایک مضبوط فلسفۂ حیات کی حامل ہیں۔ ان کی توانا قوت ارادی انہیں بالعموم ایسے جذبات واحساسات سے بچائے رکھتی ہے جو انسان کو کمزور کردیتے ہیں لیکن انسان ہزار تعقل پسند ہو اس کے اندر ایک دھڑکتا ہوا دل ہوتا ہے اور اس کے دماغ کا ایک گوشہ کبھی نہ کبھی اسے فنطاسی کی حسین دنیا میں لے جاتا ہے۔ صلابت فکر کے مضبوط قلعے میں رہتے ہوئے ایک گھٹن کا محسوس ہونا ایک فطری امر ہے۔ چنانچہ زہرا کے یہاں بھی سوچ کی ایسی لہریں پیدا ہوجاتی ہیں جو تھوڑی دیر کے لئے حقائق سے دور ہٹا کر انہیں نوسٹلجیا کی طرف لے جاتی ہیں۔ ایک خطۂ ارض سے جذباتی وابستگی، ماضی کی گرفت سے نہ چھوٹنے والی کیفیت اور بار بار پلٹ کر دیکھنے کی ادائیں RATIONALISM سے انہیں دور بھی کردیتی ہیں .... اور شاید یہی وہ مقامات ہیں جہاں جذبے فکر پر حاوی ہو کر انسان کو کچھ حسین قدریں عطا کردیتے ہیں۔ 'گرداب کی شناوری' میں ایسے متعدد مقام آتے ہیں۔

یہ آپ بیتی صرف سوانحی حقائق ہی نہیں بلکہ فکر وفلسفہ کے متعدد امکانات بھی پیش کرتی ہے۔ زہرا داؤدی نے عصر حاضر کے مسائل پر عالمانہ اور مفکرانہ انداز میں غور کرنے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ

برسبیل تذکرہ ایسے سنجیدہ مسائل بھی زیر بحث آگئے ہیں جو ہم عصر افکار میں اہمیت رکھتے ہیں۔ٹسٹ ٹیوب بے بی، فیمنزم، فیملی پلاننگ، اردن، لیبیا، عراق، ساؤتھ افریقہ، افغانستان، ملائیشیا وغیرہ جیسے مسائل و موضوعات پر اظہار خیال مصنفہ کے نقطہ نظر کی وضاحت بھی کرتے ہیں اور ہمیں سوچنے بچارنے کی دعوت بھی دیتے ہیں۔ان کے علاوہ اس آپ بیتی میں دوسرے متعدد عالمی مسائل بھی نظر آتے ہیں۔بائی ٹیکنالوجی کے اثرات، اخلاقیات کے بنتے بگڑتے نقشے، نئے رشتے ناتوں میں انسانی اقدار کی تلاش، جہیز اور اس کے معاشرتی اثرات، ایجادات اور معاشرے کے نئے خدوخال........ غرض زہرا داؤدی کی یہ آپ بیتی نجی حالات کے ساتھ ساتھ فکر کا ایک انبار بھی ہے۔قاری کے لئے آپ بیتی میں یہ انبار گراں بار بھی ہوسکتا ہے........ مگر ان نکات سے مصنفہ کی مدبرانہ، علمی اور مفکرانہ شخصیت کے متعدد نقوش ظاہر ہو جاتے ہیں اس لئے کہیں نہ کہیں سے آپ بیتی میں ان کی شمولیت کا جواز پیدا ہو جاتا ہے۔ ان امور پر مصنفہ کے فکر و نظر کے بعض گوشوں سے اختلاف کی گنجائش بھی ہے لیکن چونکہ یہ بحث خاصی طویل ہو جائے گی اس لئے فی الوقت اسے موقوف کرتا ہوں۔

مجموعی اعتبار سے 'گرداب کی شناوری' کا مطالعہ ہمیں تازگی سے ہمکنار کرتا ہے۔اپنے انداز تحریر کے اعتبار سے یہ منفرد ہے۔ایک خوبی یہ بھی ہے کہ یہ آپ بیتی اپنے آپ کو PROJECT کرنے کی غرض سے نہیں لکھی گئی ہے بلکہ یہ مصنفہ کی عملی وفکری شخصیت کا ایک ضمیمہ ہے۔ضمیمہ ہی نہیں بلکہ ایک تکملہ ہے۔اس کے علاوہ یہ ایک اظہار یہ ہے اس امر کا بھی کہ بدلتا ہوا ماحول و معاشرہ فکر و نظر کی بنیادی سچائیاں متزلزل نہیں کرسکتا۔ایک ٹھوس، جامع اور ہر دور میں زندہ رہنے والا فلسفہ لحاتی جھٹکوں سے متاثر تو ہوسکتا ہے مگر وہ ہر حال میں اپنی اساس پر قائم و دائم رہتا ہے:

حقیقت ابدی ہے مقام شبیری
بدلتے رہتے ہیں انداز کوفی و شامی